ماہنامہ
المرشد
ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ/اپریل 2010ء
فیضان محبت، باادب دل کی زمین کو
سیراب کرتا ہے۔
الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، چھتر پارک، اسلام آباد، پاکستان۔ 46001

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا

اے ہمارے پروردگار یقیناً ہم نے ای
عظیم الشان دعوت دینے والے شخص کو سنا جو کہ ایمان قبول کرنے کی
دعوت دیتے ہوئے پکار رہا تھا کہ "لوگو مانو اپنے پروردگار کی" پھر ہم نے اس کی بات مان لی۔

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ

سوائے ہمارے مالک ہمارے فائدے کیلئے
ہمارے کبیرہ گناہوں سے درگذر فرما اور ہمارے صغیرہ گناہوں کو ہم سے
دور کر دے اور ہمیں اپنے بہت نیک بندوں میں شامل کر کے اپنے پاس بلا لے۔

(پ: ۴۔ س: آل عمران۔ آیۃ ۱۹۳)

ماہنامہ

المنادی

جلد: 1 | ربیع الثانی 1431ھ / اپریل 2010ء | شمارہ: 3

الندوۃ ایجوکیشنل ٹرسٹ اسلام آباد
کا ترجمان

مؤسس و مسؤل
مفتی محمد سعید خان

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
1	ادب گہہ محبت ①	3
2	ادب گہہ محبت ②	18

پتہ. ا$خط وکتا. ـ :

ادارہ المناد شفیع پلازہ

بینک روڈ جور راولپنڈی $

ٹیلی فون: 0092-51-5111725

موبائل: 0333-5134333

E-Mail: alnadwa@seerat.net

www.seerat.net

. ائے ـ سیل زر:

بنام: النّدوہ ایجوکیشنل ٹ جو

اکاؤ ٹ نمبر 01-8637741-01

سٹینڈرڈ چارٹ ڈ بینک پ کستان د

پ کستان فی پ چہ: 25روپے

پ کستان جولانہ: 300روپے

بیرون ملک جولانہ: 25 امریکی ڈالر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادب آموز ہے ہر ایک ذرہ اپنی وادی کا
نہیں ممکن کہ گرد اڑ کر پڑے رہرو کے دامن پر

اللہ تعالیٰ نے حضرت رسالت مآب ﷺ کو مربی کے مقام پر فائز فرمایا تھا اور آپ نے اپنے اس مقام کی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت کی اور اُنہیں ایسا شاندار انسان بنایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دنیا سے جانے سے پہلے ہی اُنہیں اپنی رضا اور خوشخبری کی بشارت نازل فرمادی. آپ نے اُنہیں تربیت کے جوہر یعنی ادب سے روشناس کرایا اور زندگی کے ہر ہر شعبے میں تمیز اور ادب کے دائروں کی نشاندہی کر کے یہ بتلا دیا کہ ان دوائر کے اندر رہنا ہی انسانیت اور شرافت ہے اور اِن کو عبور کرنا دائرہ انسانیت سے خارج ہونا ہے.

اُن کی رسالت کا ایک شاہکار سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے. اپنی وفات سے پہلے آپ نے جو آخری لشکر روانہ کیا اور جس کے لیے آپ نے آخری مرتبہ جھنڈا باندھا اس کا امیر حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو آپ ہی نے مقرر فرمایا تھا. حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ بہت کم سن تھے اور ان کی قیادت میں جہاد کرنے کے لیے جو مجاہد اس لشکر میں شامل تھے اُن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے. ان دونوں حضرات کی عمر میں اتنا بڑا فرق تھا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے انتقال کے وقت حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی عمر اٹھارہ (18) برس تھی. اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً پچاس (50) برس تھی گویا کہ بتیس (32) سال کا فرق تھا.

حضرت رسالت مآب ﷺ کی طبیعت پہلے سے زیادہ کمزور ہوگئی اور لشکر آپ کی عیادت کے لیے

واپس ہوا.تا آنکہ آپ کی وفات ہوگئی.حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے اور انہوں نے اس لشکر کو روانہ کر دیا.امیر یعنی حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے بس اتنی درخواست کی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رخصت دے کر مدینہ طیبہ ہی میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی جائے.امیر لشکر بخوشی اس پر راضی ہو گئے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں ٹھہر گئے.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ادب اتنا غالب تھا کہ پھر عمر بھر جب بھی وہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو دیکھتے تو بجائے صاف سلام کرنے کے کہتے:[1]

السلام عليك أيها الأمير ورحمة الله عليه! توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنت علي أمير.	امیر لشکر السلام علیکم ورحمۃ اللہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے انتقال سے پہلے میرا،امیر آپ کو مقرر فرمایا تھا.

حضرت اُسامہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی عمروں میں بتیس[32] برس کا فرق تھا.اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسامہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اولاد کے ہم عمر تھے لیکن پھر بھی ہمیشہ ان کا اتنا ادب اور احترام کیوں رہا؟

کیا اس لیے کہ وہ ان کے امیر تھے اور مامور کو چاہیے کہ وہ اپنے امیر کا ادب کرے یا اس لیے ان کا عہدہ بڑا (امارت) تھا اور یہ ایک بڑے عہدے کا احترام تھا،نہیں یہ ادب اِس لیے تھا کہ جس ہستی نے اُنہیں امیر بنایا تھا یہ اُن کے حکم کا ادب تھا.ہر لحہ اس ہستی کا ادب اور ان کے فرمان کا احترام حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طاری تھا.یا دونوں باتیں جمع ہوگئی تھیں.قانون کا احترام،اپنے امیر کا ادب خواہ وہ عمر میں چھوٹا ہو یا بڑا اور حضرت رسالت مآب ﷺ کی محبت،ان کی یاد اور ان کا حکم اس ادب کا محرک تھا.

پھر یہ ایک واقع ہی نہیں،امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی تربیت ہی ایسے کی گئی تھی کہ احترامِ انسانیت ان کی فطرت ثانیہ تھی.

---

[1] الفوائد الغراء، ج: ٣، ص: ٩٢.

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا احترام تو اُنہیں کرنا ہی چاہیے تھا کہ وہ ان سے بلاشبہ افضل بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُمت کے سب سے افضل فرد تھے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے احترام میں بھی کچھ کسر نہیں اٹھا رکھی. کہاں بلال رضی اللہ عنہ کہ اپنی ذات میں اگرچہ اکابر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں شمار کیے جاتے ہیں مگر افضلیت میں امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہی کا پلڑا ہر طرح سے بھاری ہے. مراتب کے اس فرق کے باوجود فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:[1]

ابو بکر سیدنا اعتق بلالاً سیدنا. — ہمارے آقا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہمارے دوسرے آقا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید کر آزاد کیا تھا.

کس ادب واحترام سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا نام لیتے ہیں اور اُنہیں اپنا دوسرا آقا ارشاد فرماتے ہیں. یہ ہے باہمی احترام اور مرتبہ شناسی.

جب تک حضرت رسالت مآب ﷺ نے اُنہیں اللہ تعالیٰ سے مانگا نہیں تھا، وہ اس وقت تک مکہ مکرمہ کے ظالم اور جابر سرداروں میں سے ایک سردار تھے. ہمت اور شجاعت کا ظالمانہ رُخ اختیار کرنے والا یہ واحد شخص تھا جو ارادۂ قتل سے دن کی روشنی میں تلوار لے کر چل پڑا تھا. باقی تمام ظالم اور جابر کبھی بھی یہ جرأت نہ کر سکے تھے حتی کہ ہجرت سے قبل تک ان کی جرأت نہ تھی کہ قتل کے لیے گھر سے نکل آتے. کہاں اکیلا عمر یہ کام کرنے چلا تھا اور کہاں سارے مکہ کے ظالم جمع ہوئے، مشورہ ہوا، ہر ایک ظالم نے ناحق خون بہانے کا عہد کیا اور پھر رات کی تاریکی میں حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا. ان ظالموں کو ظلم کرنے کے لیے بھی جو جرأت درکار تھی وہ فریب آمیز تھی اور کہاں عمر جس بات کو حق سمجھتا تھا، تنِ تنہا اس ناپاک ارادے کی تکمیل کے لیے چل پڑا تھا مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا.

اس لیے ان سے زیادہ کون جانتا تھا کہ ظلم کیا ہوتا ہے، وہ مشرکانہ جبر کے نظام کا ستون رہ چکے تھے، لیکن اب اُن کے لیے کسی کے ہاتھ اُٹھ چکے تھے. اب وہ مظلومین کی پناہ گاہ تھے. ضعفاء کا سہارا تھے. ظالم کی

---

[1] سیر أعلام النبلاء، بلال ابن رباح، رقم: ٧٦، ج: ١، ص: ٣٤٩.

کلائی موڑ کر مظلوم کا حق ، دلانا جانتے تھے جب کایا پلٹ ہوئی تو اُن مظلومین پر جو ظلم ہو چکے تھے اُن کی دادرسی میں مصروف رہے. بلال ، عمار بن یاسر اور صہیب کے خون سے مکہ مکرمہ میں ظالموں نے ہولی کھیلی تھی ان کی عزتیں تاراج کی گئی تھیں اور ان کے حقوق پامال کیے گئے تھے جبکہ یہ اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں برت رہے تھے.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان مظلومین کو کس نگاہ سے دیکھا ؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اتنا احترام تھا کہ فرمایا:[1]

وھذا بلا ل سیدنا حسنة من حسناته.

او ر انہیں دیکھو! یہ ہمارے آقا بلا ل ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نیکیوں میں سے صرف ایک نیکی تو یہ ہیں.

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی منقبت اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی سیادت کا احترام اور اعتراف.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا اور وجہ تقرری میں فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں عمار پر بہت ظلم ہوئے ہیں اور میں نے چاہا کہ مظلوموں کو حکومت ملے.

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی مظلومیت کا یہ ادب کیا کہ وفات سے چند دن قبل شدید زخمی ہونے کے باوجود فرمایا کہ جب تک شوریٰ اپنا خلیفہ منتخب نہ کرے، ان کے بجائے مسجد نبوی میں ان کے مصلے پر نماز حضرت صہیب رضی اللہ عنہ ہی پڑھائیں گے.[2]

حتی کہ وصیت فرمائی کہ ان کا جنازہ بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ پڑھائیں اور پھر یہی ہوا اس لیے کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر چھوٹے ، بڑے ، غنی ، فقیر ، اپنے ، پرائے سب کا احترام غالب رہا

---

[1] سیر أعلام النبلاء ، بلال ابن رباح، رقم :٧٦، ج:١، ص:٣٥٩.

[2] وأوصى إليه عمر بالصلاة بجماعة المسلمين حتى يتفق أهل الشوري، استخلفه على ذلك ثلاثا.

(الاستیعاب، باب حرف الصاد، رقم :١٢٣١، ج: ٢، ص: ٢٨٦).

اور وہ سب کے حقوق ادا کرتے رہے.

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ عیادت کے لیے حاضر ہوئے. حضرت رسالت مآب ﷺ پر ضعف اتنا غالب آ چکا تھا کہ گفتگو کرنی دشوار تھی لیکن آپ چاہتے تھے کہ اُسامہ کے لیے دعا مانگی جائے تو اپنے دونوں ہاتھ اُن پر رکھ کر پھر دعا کے لیے اُٹھائے تو اُسامہ کہتے ہیں:[1]

فأعرف أنه يدعو لي. میں یہ سمجھ گیا کہ میرے لیے دعا مانگ رہے ہیں.

غالباً یہ آخری شخص تھے جن کے لیے حضرت رسالت مآب ﷺ نے ہاتھ اُٹھائے تھے.

تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جانتے تھے کہ وہ جوان اور بہادر لڑکے جن سے حضرت رسالت مآب ﷺ کو بہت تعلق خاطر ہے اُن میں سے ایک حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں.

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کا انتقال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافتِ عادلہ کے آخری دور میں ہوا اور اُن کے انتقال کے بعد رات ہی کو تجہیز و تکفین ہوئی. حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اِس جنازے میں شریک تھے فرمایا:[2]

عجلو بحِب رسول الله قبل أن تطلع الشمس. حضرت رسالت مآب ﷺ کے محبوب کو سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی دفن کر دو.

جنازے میں تاخیر شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے اس لیے بہت جلد اِس کام کو نمٹانے کا، ارشاد فرمایا لیکن حضرت اُسامہ سے حضرت رسالت مآب ﷺ کی محبت کا اعلان آخر تک ہوتا رہا حتی کہ جنازے میں بھی اس محبت کا اعلان سن کر اُن کی روح کیسے مچلی ہوگی کہ نسبت اور وہ بھی محبت کی نسبت تا دم آخر برقرار رہی.

یہ اعلان تو بعد میں ہوا، اُسامہ کی روح تو حضرت رسالت مآب ﷺ کے ہاں پہلے ہی حاضر ہوگئی ہوگی

---

[1] سير أعلام النبلاء ،اسامة بن زيد ، رقم:١٠٤، ج:٢، ص:٥٠٣.

[2] سير أعلام النبلاء ،اسامة بن زيد ، رقم:١٠٤، ج:٢، ص:٥٠٧.

کیونکہ جتنی محبت اُسامہ کو اُن سے تھی، اس سے زیادہ محبت تو اُنہیں اُسامہ سے تھی، کشش ادھر سے زیادہ تھی اس لیے اب تقریباً پچاس 50 برس کے بعد اپنے محبوب اور خادم اور خادم زادے اُسامہ بن زید کو دیکھ کر کیسے خوش ہوئے ہوں گے. اُسامہ زبانِ حال سے کہتے ہوں گے:

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں ، نامہ بر ، سے ، ہم آگے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب خلیفۂ وقت ہوئے اور حکومتی تنخواہیں اور وظائف مقرر کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو اُنہیں یہ محبت اور اُس کا احترام برابر یاد رہا. اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی تنخواہ تین ہزار 3000 مقرر ہوئی اور حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی پانچ سو زیادہ یعنی ساڑھے تین ہزار 3500. باادب وسعادتمند بیٹے نے اس فرق کو جاننا چاہا تو امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:[1]

لأن أباه كان أحب إلي رسول الله من أبيك، وهو أحب إلي رسول الله ﷺ منك ، فآثرت حِب رسول الله على حِبي.

بیٹے! حضرت رسالت مآب ﷺ کو تمہارے والد (عمر) سے زیادہ اُسامہ کے والد (زید) سے محبت تھی اور آپ سے زیادہ وہ اُسامہ سے محبت کرتے تھے. اس لیے میں نے اپنی محبت (اپنے بیٹے عبداللہ) پر حضرت رسالت مآب ﷺ کی محبت (اُسامہ) کو ترجیح دی ہے (اور اسی لیے ان کی تنخواہ پانچ سو زیادہ ہے).

یہ عالم تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ادب کا کہ ہر مقام پر حضرت رسالت مآب ﷺ کا خیال ہے کہ وہ کس بات کو ترجیح دیتے تھے! ان کی پسند کیا تھی اور اُنہیں کس سے زیادہ محبت (غالب) تھی. یہاں تک کہ یہ تو وہ افراد تھے. جہاں، حضرت رسالت مآب ﷺ کا کوئی خونی رشتہ نہیں بنتا تھا، لیکن جہاں

[1] سير أعلام النبلاء ، اسامة بن زيد ، رقم: ١٠٤ ، ج:٢ ، ص: ٤٩٩ .

خونی رشتے بنتے تھے اور جو اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم تھے، اُن کے ادب و احترام اور محبت و شفقت میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی کسر روا نہیں رکھی تھی. اپنے بیٹے اور اس درجے کے افراد کے لیے تین ہزار تنخواہ مقرر ہوئی، حضرت اُسامہ کے لیے ساڑھے تین ہزار اور بدری صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے پانچ ہزار مقرر فرمادی.

سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی بدری تھے ان کے لیے تو پانچ ہزار مقرر ہوئی ہی تھی حکم فرمایا کہ ان کے دونوں بیٹوں سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کے لیے بھی پانچ، پانچ 5000 ہزار مقرر کیے جائیں[1]. کیوں؟ اس لیے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے نواسے تھے اس رشتے کا ادب اور احترام ضروری تھا اس لیے ادب اور نیازمندی کا اظہار اسی صورت میں ہوا.

اللہ تعالیٰ کے قوانین دو طرح کے ہیں ایک تو شریعت کے قوانین جن کے مطابق اہل ایمان کو اپنی زندگی گذارنے کا حکم ہے، جیسے عقائد، عبادات، معاملات، معیشت وغیرہ اور دوسرے تکوینی قوانین جیسے پیدائش، زندگی، موت، عزت، ذلت، اقتدار کا ملنا اور چھننا وغیرہ. اللہ تعالیٰ کا یہ تکوینی قانون برابر اپنا کام کرتا رہتا ہے. کچھ بچوں کو دنیا میں بھیج دیتا ہے، اور کچھ روحوں کو واپس بلا لیتا ہے، کچھ لوگوں کو اقتدار کی آزمائش میں ڈالتا ہے اور کچھ کو اس امتحان سے بچا لیتا ہے اور انہی تکوینی قوانین کے تحت پانی ہمیشہ نشیب میں بہتا ہے. ہر رات کی صبح اور ہر شام کی سحر ہوتی ہے. جو ظلم کرتا ہے اس کی سزا پاتا ہے اور جو ادب کرتا ہے اس کا ادب کیا جاتا ہے.

امیر المؤمنین سیدنا فاروق اعظم عمر رضی اللہ عنہ جب ہر ہر مقام پر ادب سے پیش آتے رہے تو یہ ضرور تھا کہ ان کا بھی ادب ہوتا. وہ احترام کرتے رہے تو تکوینیات کے سلسلے میں اُنہیں اس احترام کی جزاء احترام کی صورت میں ملنی ہی چاہیے تھی.

---

[1] ألحق الحسن والحسين بفريضة أبيهما، لقرابتهما من رسول الله ﷺ، فرض لكل منهما خمسة آلاف درهم. (سير أعلام النبلاء ،الحسن بن علي بن أبي طالب ، رقم :٤٧، ج:٣، ص:٢٥٩).

ان کی وفات کے دن سے جو احترام شروع ہوا ہے تو اب تک مسلسل جاری ہے. اس سے زیادہ احترام ان کا کیا ہوتا کہ اُنہیں اپنے محبوب دوست، خلیفۂ اول اور اپنے مخدوم ومحبّ گرامی قدر حضرت رسالت مآب ﷺ کے پہلو میں جگہ ملی اور اب تک مقبولانِ بارگاہِ الٰہیہ میں ہمیشہ ان کا ذکر خیر ہی بلند ہوتا ہے. عدل میں دورِ فاروقی قیامت تک ضرب المثل ٹھہرا اور احتساب غیر وخویش میں اب تک وہیں سے استدلال کیا جاتا ہے. ان کے احترام کی ایک مثال وہ بھی ہے کہ امیر المؤمنین خلیفۂ رابع سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں خطبہ ارشاد فرمایا اور سامعین سے سوال کیا.

من خير هذه الأمة بعد نبيها؟	آپ لوگ یہ بتائیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے بعد اس امت میں سب سے اچھا شخص کون ہے.

وهب السُوَائی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا آپ سب سے بہتر ہیں. آپ نے فرمایا:[1]

لا، خير هذه الامة بعدنبيها ابوبكر، ثم عمر، وما نبعد أن السكينة تنطق علي لسان عمر.	ایسے نہیں ہے. حضرت رسالت مآب ﷺ کے بعد اس اُمت میں سب سے بہتر شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور پھر اُن کے بعد امیر المؤمنین حضرتِ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سب سے بہتر انسان تھے اور ہم تو یہی کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص قسم کی رحمت (السكينة) کے ساتھ ان کی زبان سے فیصلے صادر ہوتے ہیں.

یہ اس ادب اور احترام کا اعتراف اور الفاظ ہیں جن کے ذریعے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کیسے نہ بولتی اور اُن کے ساتھ رحمت حق کی

---

[1] مسند الامام احمد بن حنبل، مسند علي بن أبي طالب، رقم الحديث: ٨٣٤ . ج:٢، ص:٢٠٠.

معیت کیسے نہ ہوتی کہ حق تو اُن کے دل میں ڈالا جاتا تھا اور مستقبل کی سچائیاں اُن کے دل کے آئینے میں حال تھیں. اُنہیں صداقت کا الہام ہوتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے اُن کی زبان کے ذریعے لوگوں کو سنائے اور بتائے جاتے تھے.

امام عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ:

> سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اُس گرامی نامے کے الفاظ کا تذکرہ ہوا جو انہوں نے ایران پر حملے سے قبل، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تحریر فرمائے تھے. فقرہ یہ تھا:
>
> ''میرے جی میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ آپ جب اپنے دشمنوں پر حملہ کریں گے تو انہیں شکست دیں گے''. سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ پیشن گوئی کیسے کر دی تھی؟ بھئی! ہم تو پہلے ہی سے اس بات کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت عمر کی زبان سے بولتی ہے اور قرآن کریم میں کتنے ہی مقامات ایسے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ کی جو رائے تھی، اُسی طرح وہ آیات نازل ہوئی ہیں.[1]

امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی یہ اصابت رائے، توافق بالقرآن الحکیم اور اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کا اُن کے ساتھ ہونا یہ تمام انعامات تھے جو اس ادب اور احترام کے رویے کے اثرات تھے. جو ادب اور احترام انہوں نے ہمیشہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے بارے میں روا رکھا تھا. اسلام کے ابتدائی دور میں قریش کے مظالم نے حدوں کو چھولیا. حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یکے بعد دیگرے حبشہ ہجرت کر گئے اور جب حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما جیسی عبقری شخصیات

---

[1] ثلاث رسائل في موافقات عمر بن الخطاب رضي الله عنه، كتاب نزهة ذوي الالباب فيما وافق به ربه عمر بن الخطاب رضي الله عنه وارضا للشيخ ابو عبدالله محمد بن الشيخ برهان الدين المقدسي، رقم: ١٠، ص: ٨٩.

مسلمان ہوگئیں تو قریش زچ ہوکر رہ گئے. انہوں نے تمام قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر بنو ہاشم سے مطالبہ کیا کہ محمد (صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو قتل کرنے کے لیے یا تو از خود ہمارے حوالے کردو اور یا پھر ہم سب مل کر تمہارا مقطاعہ (Boycott) کردیں گے. تمہیں ایک مقام پر قید کردیا جائے گا اور ایسا سوشل بائیکاٹ ہوگا کہ کھانے پینے تک کی کوئی چیز اِس شہر (مکہ مکرمہ) میں نہ تو تم خرید سکو گے اور نہ ہم بیچیں گے.

بنو ہاشم نے قریش کے اِس مطالبے کو ماننے سے انکار کردیا اور سات نبوی میں ایک معاہدہ — جس پر تمام قبائل نے دستخط کیے تھے — تحریر کرکے در کعبہ پر آویزاں کردیا گیا.

معاہدے کا خلاصہ یہ تھا کہ بنو ہاشم جب تک محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے کے لیے ان تمام قبائل کے حوالے نہیں کرتے، یہ تمام قبائل بنو ہاشم سے مکمل قطع تعلق رکھیں گے. قبل اس کے کہ کسی لڑائی یا خون کی نوبت آتی بنو ہاشم اپنی آبائی زمین " شَعُب اَبِیُ طَالِبُ " میں چلے گئے. اور دیگر قبائل کے جو بھی حضرات اسلام قبول کر چکے تھے ان کا بھی محاصرہ ہوا اور انہوں نے بھی " شَعُب اَبِیُ طَالِبُ " میں پناہ لے لی.

تین برس تک یہ محاصرہ جاری رہا. ہاشمی بچے دودھ اور کھانے کو بلکتے، روتے اور اُن کی آوازیں سن کر باہر بیٹھے ہوئے قریش کے ظالم ہنستے. حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہمارا حال یہ تھا درختوں کے پتے توڑ کر کھاتے اور ایک مرتبہ تو رات کو بھوک نے ستایا، کھانے کو کچھ تھا نہیں لیکن ایک سوکھے ہوئے چمڑے کا ٹکڑا ہاتھ آیا. اُسے دھو کر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھا لیا.

تین برس تک اس ظلم کی چکی چلی اور مظلومین خوب پسے. یہ ظالم بھی آخر انسان تو تھے ہی. اب انہیں ترس آنا شروع ہوا اور ایک دن مطعم بن عدی اپنے دوستوں، ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن الاسود اور سہل بن بیضاء کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہوا اور اس معاہدے کو اُتار کر دونوں ہاتھوں سے چاک کر کے پھینک دیا، ابوجہل اور مختلف لوگ چلّائے لیکن یہ چاک کرنے والے گویا کہ مکہ مکرمہ کے جگر کے ٹکڑے اور قبائل کے عمائدین تھے، انہیں کون روک سکتا تھا.

مطعم بن عدی، ابوالبختر ی، زہیر وغیرہ نے ہتھیار اٹھالیے اور انہی ہتھیاروں کے سائے میں بنو ہاشم اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو " شَعْبِ اَبِی طَالِبْ " سے باہر نکال لائے. معاہدہ چاک ہوا اور پابندیاں، لگانے والوں نے خود ہی یہ پابندیاں ختم کردیں. وقت گذر گیا اور جب غزوۂ بدر کے لیے کفار مکہ نے نفیر عام دی تو سب چل پڑے. البتہ کچھ لوگ ایسے تھے، جو اس لڑائی میں جانا بالکل پسند نہیں کرتے تھے لیکن لگے مارے مجبور کر کے لائے گئے تھے.

ان حضرات میں سے ایک صاحب — جن کا نام مندرجہ بالا سطور میں ابھی آپ نے پڑھا ہے — سہل بن بیضاء بھی تھے. وہ مکہ مکرمہ میں اسلام قبول کر چکے تھے لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر اِس کا اظہار کرنا مناسب نہ تھا. حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اُنہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور پھر وہی ان کے اسلام کے گواہ تھے.

رن میں معرکہ پڑا کفار مکہ کو شکست ہوئی اور جب اُن کے قیدی سامنے لائے گئے تو حضرت رسالت مآب ﷺ نے مختلف حضرات سے مشورہ لیا کہ ان قیدیوں کا کیا کیا جائے اور آخر کار آپ نے قیدیوں کے سامنے اعلان کیا کہ:[1]

أنتم عالة، فلا ينفلتن منهم أحد إلا بفداء، أو ضربة عنق.	آج آپ لوگوں کے پاس کچھ مال نہیں ہے لیکن اب صورتحال یہ ہے کہ آپ کچھ رقم منگوا کر فدیہ ادا کریں تو آپ کو رہائی مل جائے گی ورنہ قتل کردیا جائے گا.

جو قیدی یہ اعلان سن رہے تھے ان میں سہل بن بیضاء بھی تھے، جو خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے تھے اور مشرکین مکہ انہیں زبردستی نکال لائے تھے. ان کے اسلام کے ایک ہی گواہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اُٹھے اور کہا:

اللہ کے رسول (قیدی جو قتل کیے گئے تو) سہل بن بیضاء کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ میں نے ان سے

[1] مسندالامام احمد بن حنبل، ج:٦، ص:١٤٠.

اسلام کو پسند کرنے کے جملے سنے ہیں.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ کہنے کوتو کہہ گئے اوران کے پاس دلیل بھی تھی کہ یہ مسلمان ہو چکے ہیں لیکن ان کا یہ جملہ سن کر حضرت رسالت مآب ﷺ خاموش ہوگئے اوران پر قیامت گذر گئی. ادب کا یہ حال تھا کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:[1]

فما رأيتني في يوم أحوف أن تقع علي حجارة من السماء في ذلك اليوم.	میری زندگی میں اس سے بڑھ کر خوف کا کوئی دن نہیں آیا. مجھے اس دن ایسے لگا جیسے مجھ پرآسمان سے پتھر برسیں گے (کہ میں نے سہل بن بیضاء کو مستثنی کرنے کی جرأت کیوں کر کی؟)

صحیح اور ثابت شدہ حقیقت پر بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا. ادب اوراحترام کا اس قدر غلبہ تھا حتی کہ ایک سکوت کے بعد حضرت رسالت مآب ﷺ نے فرمایا:[2]

---

[1] ثلاث رسائل فی موافقات عمر بن الخطاب رضي الله عنه، كتاب نزهة ذوی الالباب فيما وافق به ربه عمر بن الخطاب رضي الله عنه وارضاه، للشيخ ابو عبدالله محمد بن الشيخ برهان الدين المقدسی ، رقم : ٥٠، ص:١٣٤.

[2] بعض محدثین نے اس واقعے کو سہل بن بیضاء کے بھائی سہیل بن بیضاء رضی اللہ عنہ کے متعلق نقل کر دیا ہے حالانکہ حقیقت اور صحیح بات یہی ہے کہ یہ واقعہ حضرت سہل بن بیضاء رضی اللہ عنہ ہی کا ہے کیونکہ ان کے بھائی سہیل بن بیضاء رضی اللہ عنہ تو بہت قدیم الاسلام تھے حتی کہ وہ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی پہلے مسلمان ہو چکے تھے. انہوں نے اپنا اسلام کبھی چھپایا بھی نہیں تھا اور لطف یہ کہ بدر میں وہ خود حضرت رسالت مآب ﷺ کی قیادت میں مصروف جہاد رہے ہیں اور حضرت سہل رضی اللہ عنہ معروف معنی میں بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے نہیں تھے. البتہ بدر کے بعد کے معرکوں میں شریک رہے ہیں کیونکہ بدر کے اس واقعے کے بعد انہوں نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر لی تھی پھر تمام عمر وہیں رہے اور یہ دونوں بھائی جنت البقیع میں مدفون ہوئے رضی اللہ تعالیٰ عنہما.

''درست ہے سہل بن بیضاء اس سے مستثنیٰ ہیں''.

اب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی جان میں جان آئی.

اس ادب اور تواضع کا ایک نظارہ اس وقت بھی دیکھنے میں آیا جب آپ کو خلافت نے کوفہ سے مدینہ طیبہ واپس آنے کا حکم دیا. کوفہ کے لوگوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا بلکہ آپ سے درخواست کی کہ آپ خلافتِ عثمانی کے خلاف بغاوت کر دیں اور ہم ہر طرح سے آپ کا ساتھ دیں گے. خلافت کا اور امیر المؤمنین حضرت سیدنا عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کا جو ادب اور احترام آپ کے دل میں جاگزیں تھا اس کا بہت کچھ اندازہ اس جواب سے ہوسکتا ہے، جو اس مطالبے پر آپ نے مظاہرین کو دیا فرمایا:[1]

إن له علي حق الطاعة ولا أحب أن كون أول من فتح باب الفتن.

امیر المؤمنین حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا مجھ پر یہ حق بنتا ہے کہ میں ان کی اطاعت کروں اور میں ہر گز نہیں چاہتا کہ اس اُمت میں وہ پہلا شخص بن جاؤں جس نے فتنوں کا دروازہ کھولا تھا.

یہ ہے خلافت کا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا باہمی ادب واحترام.

حضرت رسالت مآب ﷺ نے ان سب کو یہ تعلیم دی تھی کہ وہ اختلاف کے باوجود ہر ایک کے حقوق کو ادا کرتے رہیں اور اپنے چھوٹے اور بڑے کی حدِّ ادب پہچانتے رہیں.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہی وہ فطرتِ سلیمہ اور معتدل مزاج تھا جس کی وجہ سے ہر صحابی اور تابعی رضی اللہ عنہم، ان کی عزت کرتا تھا. یہاں تک کہ امیر المؤمنین حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خود اپنے دور خلافت میں بھی ان کے علم اور بلندیٔ مرتبہ کے قائل اور معترف تھے. انہی کے دور خلافت کا واقعہ ہے کہ ابو وائل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا لباس ٹخنوں سے نیچے ہے تو اسے سمجھایا کہ اسے ٹخنوں سے اوپر کر لیں. اس نے

---

[1] الإصابة، حرف العين، رقم: ٤٩٧٠، ج:٤، ص:٢٠١.

ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ ابن مسعود! آپ کا لباس بھی ٹخنوں سے نیچے ہے، پہلے آپ اپنے آپ کو درست کیجیے. آپ نے اپنا عذر بیان کیا اور خاموش ہو گئے.

اس واقعے کی اطلاع امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو انہوں نے اس شخص کو سزا دی اور فرمایا:[۱]

''کیا تم عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے منھ آتے ہو''.

صحیح نصیحت کو قبول نہ کرنا، اپنے سے بڑوں کے منھ آنا اور یوں ترکی بہ ترکی جواب دینا. یہ سب بے ادبی کی باتیں تھیں اور آج تک بھی بے ادبی ہی کی باتیں ہیں. اور وہ اسی بے ادبی پر سزا کے مستحق ٹھہرایا گیا تھا.

یہ ایک مزید دلیل ہے اس دعوے کی کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کس سختی سے ادب و احترام کی روایات کو برقرار رکھنے کے قائل تھے.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں بصرہ والوں کی تعلیم اور قانون نافذ کرنے کے لیے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو وہاں بھیجا. حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اللہ کی قسم بصرہ والوں کو وہاں آنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے اتنا نفع نہیں ہوا، جتنا کہ ان کے وجود سے ہوا.

حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے وہاں تعلیم کو عام کیا اور قاضی ہونے کی حیثیت سے قانون کا نفاذ بھی کیا. اتنے متواضع تھے کہ فرمایا میری تمنا ہے کہ کاش میں راکھ ہوتا جسے ہوائیں اڑا کر بے نام ونشان کر دیتیں. سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جن حضرات کا بھی اختلاف ہوا، یہ دونوں جماعتوں سے بالکل الگ رہے. صبح ان کی آنکھ کھلتی تھی تو فرشتے قطار باندھ کر کھڑے ہوتے تھے اور ان سے مصافحہ کرتے تھے. باون[52] ہجری میں ان کا انتقال ہوا. اور ادب کا اتنا غلبہ تھا کہ فرماتے تھے:[۲]

---

۱ الإصابة، حرف العين، رقم: ٤٩٧٠، ج:٤، ص:٢٠١.

۲ سير أعلام النبلاء، رقم: ١٠٥، ج:٢، ص:٥٠٨.

مـامست ذكري بميني منذ بايعت بها رسول الله صلي الله عليه وسلم.	میں نے جب سے اپنے اس دائیں ہاتھ سے حضرت رسالت مآب ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی ہے، تب سے اس ہاتھ سے پوشیدہ اعضاء کو نہیں چھوا.

یہ تھا ادب کہ جس ہاتھ نے حضرت رسالت مآب ﷺ کا ہاتھ چھوا ہے، وہی ہاتھ ان اعضاء کو بھی لگے جنہیں عرف عام میں ذرا ناپاک سمجھا جاتا ہے یا ممکن ہے بے دھیانی میں وہاں ناپاکی کے کچھ اثرات رہ گئے ہوں اور وہ ناپاکی اس ہاتھ کو لگ جائے. ایسے نہیں ہونا چاہیے.

یہ شریعت کا کوئی حکم نہیں تھا، اور نہ ہی حضرت رسالت مآب ﷺ نے انہیں یہ تعلیم دی تھی بلکہ ان کے من کی گہرائیوں میں جو محبت رچ بس گئی تھی، اُس نے اِس ادب کو جنم دیا تھا محبت ادب سکھاتی ہے اور یہ احتیاط اس محبت کا سچا مظہر تھی.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی رعایا کو تعلیم دینے اور ان کو ادب سکھانے کے لیے ایسے ہی باشعور، تعلیم یافتہ اور باادب حضرات کو حکومتی عہدے دیا کرتے تھے. تا کہ یہ حضرات جہاں بھی جائیں لوگوں کی تربیت بھی کر سکیں.

عوام کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کو دیکھ کر ان کا مذہب و مسلک اور ان کی پیروی اختیار کرتے ہیں. اور کچھ قدرتی طور پر بھی یہ اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ لوگ اپنے حکمرانوں کی راہ پر چل پڑتے ہیں. امیر المؤمنین حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس بات سے بخوبی واقف تھے، اس لیے انہوں نے کبھی یہ کوتاہی نہیں کی کہ کسی اخلاقی طور پر کمزور فرد کو کسی بڑے عہدے پر فائز کر دیں اور اسی طرح بالواسطہ طور پر عوام کی حالت خراب ہو جائے اور ان کی صحیح تربیت نہ ہو سکے. حکمران جب بے ادب ہوں تو رعایا بھی بے ادب ہو جاتی ہے. حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود بھی باادب تھے، ان کے مقرر کردہ خلافت کے نمائندے بھی باادب تھے اور اس تمام ادب کا منبع حضرت رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ گرامی قدر تھی اور اللہ تعالیٰ نے ادب و احترام کا ایک بڑا حصہ آپ کی طبیعت میں ودیعت فرمایا تھا.

ادب گہہ محبت

②

اور آپ سے یہ ادب صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہی نہیں سیکھا تھا. بلکہ تمام حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس چشمہ فیض، سے اپنا حصہ پایا تھا.

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہر قبیلے کے افراد کا اصرار تھا کہ آپ اپنی رہائش کے لیے ان کا علاقہ منتخب فرمائیں اور اُنہیں یہ شرف حاصل ہو کہ ان کی زمین حضرت رسالت مآب ﷺ کا ٹھکانہ بنے. محبت اور عقیدت کے اسی جذبے کے تحت بہت سے حضرات نے آپ کی اونٹنی کو روکنے کی کوشش بھی کی کہ وہ بیٹھ جائے لیکن آپ نے فرمایا اسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جہاں کا حکم ہوا ہے، یہ خود وہاں ٹھہر جائے گی.

بالآخر سیدنا حضرت ابو ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ کا ستارۂ قسمت چمکا اور اونٹنی نے ان کے گھر کے سامنے ڈیرہ ڈال دیا. ان کی خوشی قابل دید تھی اپنے گھر کا نچلا حصہ خالی کروایا اور حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنے سامان سمیت اس گھر کو رونق بخشی.

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ محترمہ سمیت گھر کے اُوپر کی منزل میں، اُٹھ گئے لیکن ادب اور محبت کا جذبہ جو محبّ کو خود راہ دکھاتا ہے، غالب آیا اور انہوں نے سوچا کہ ہم اوپر رہیں اور حضرت رسالت مآب ﷺ، نچلی منزل میں قیام فرما ہوں یہ تو مناسب نہیں. حاضر ہوئے اور عرض کیا:

یا رسول اللّٰہ لا ینبغی ان نکون فوقك — یارسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) یہ تو بالکل مناسب نہیں ہے کہ ہم آپ سے اوپر کی منزل میں ہوں.

حضرت رسالت مآب ﷺ کا سامان اُوپر منتقل کیا گیا اور وہ سامان تھا ہی کیا؟ کل متاع حیات بقدر ضرورت. اب کھانا بھی نیچے سے پک کر اُوپر پیش کیا جانے لگا تھا اور جو کچھ بچ کر آتا، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ ہی کی زبان سے سُن لیجیے کہ پھر وہ اس بچے ہوئے کھانے میں کیا تلاش کرتے تھے اوراس کھانے کا کیا کرتے تھے؟ اُنہوں نے ایک مرتبہ حضرت رسالت مآب ﷺ سے عرض کیا:[1]

كنت ترسل بالطعام، فأنظر، فإذا رأيت أثر أصابعك، وضعت فيه يدي.	میں آپ کی خدمت میں کھانا بھجواتا ہوں. پھر (جب کھانا واپس آتا ہے تو) اس میں خوب غور سے تلاش کرتا ہوں، اور جہاں جہاں آپ کی انگلیوں کے نشانات ہوتے ہیں، پھر وہیں سے کھانا شروع کرتا ہوں.

یہ ہے اُس برکت کے چاہنے کی اصل جو اس وجودِ مسعود میں تھی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت اور ان کا طرزِ عمل جو کہ شریعت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے ان کے افعال کو نہ تو بدعت کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ دین میں کسی اضافے کو برداشت کرنے والے تھے. علم اور تنقید کا وہ سنہرا دور تھا اور خلیفۂ وقت سے لے کر عام رعایا تک کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کسی غیر شرعی امر کا مرتکب ہو اور پھر اسے تنقید کا سامنا نہ کرنا پڑے.

عبدالرحمٰن بن رزین رحمۃ اللہ علیہ جو کہ تابعین میں سے ہیں '' رَبَذَة ''بستی میں، حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ آنے والے زائرین کو دکھایا اور فرمایا:

بايعت بيدي هذه رسول الله صلى الله عليه وسلم.	میں نے اپنے اس ہاتھ سے حضرت رسالت مآب ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی.

تو اُس وقت، جو تابعین بھی حاضر خدمت تھے، انہوں نے، ان کے ہاتھ کو تھاما اور اسے بوسہ دیا.

---

[1] سير أعلام النبلاء، ابو ايوب الأنصاري، ج:٢،ص:٤٠٦.

اس دست بوسی سے نہ تو حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے انہیں روکا اور اور نہ ہی کسی اور نے ان کے اس فعل پر اعتراض کیا. کیونکہ سب جانتے تھے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی انگلیوں اور ہاتھوں نے جس جسم اور جگہ کو چھوا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کے آثار، زمانے کے گزر جانے کے باوجود، ابھی تک وہاں پہ موجود ہیں.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فطرتاً بہت باصلاحیت انسان تھے. اسلام نے انہیں ان کی صلاحیتوں کا بہتر سے بہتر مصرف سُجھایا اور پھر جب ان کا دور خلافت آیا تو انہیں یہ موقع ملا کہ وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں. ہر لمحہ جوابدہی کا احساس، احتساب نفس اور تواضع ان کا شعار تھا. جمعہ کے دن خطبہ ارشاد فرمانے اور امامت کے لیے تشریف لا رہے تھے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر کے پرنالے سے خون بہنے لگا اور اس کے چھینٹوں نے آپ کے کپڑوں کو ناپاک کر دیا. اس خون کی حقیقت یہ تھی کہ گھر میں دو چوزے ذبح کیے گئے تھے اور خون کو بہانے کے لیے پانی چھوڑا گیا جس سے یہ چھینٹے اڑے. امیر المومنین رضی اللہ عنہ واپس تشریف لے گئے، لباس تبدیل کرنے کے بعد واپس آئے اور اس پرنالے کو راستے سے اُکھاڑنے کا حکم دے دیا.

خلافت راشدہ میں قانون کا فوری نفاذ ہوتا تھا. یہ نہیں تھا کہ قانون تو ہے لیکن اس کے نفاذ میں بغیر کسی عذر کے تاخیر ہو جائے. جس قوم اور معاشرے میں قانون کے نفاذ میں تاخیر ہوتی ہے وہاں کبھی بھی مظلوم کو انصاف نہیں ملتا.

یہاں کیا دیر تھی. نماز جمعہ سے پہلے حکم دیا کہ اس پرنالے کو یہاں سے اُکھیڑ دیا جائے اور نماز جمعہ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ پرنالہ اُکھیڑا جا چکا تھا.

نماز جمعہ کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی قسم اس پرنالے کو تو اس جگہ پر حضرت رسالت مآب ﷺ نے نصب فرمایا تھا''.

امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس حقیقت کا علم نہ تھا اس لیے معذرت کرنے لگے اور حضرت عباس

رضی اللہ عنہ کو قسم دی کہ وہ ان کی کمر پر کھڑے ہوکر اس پرنالے کو وہیں نصب کردیں جہاں پر یہ پہلے نصب تھا. چنانچہ:[1]

ففعل ذلك العباس رضی اللّٰه عنه. حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یونہی کیا.

پرنالے کو کیا حضرت رسالت مآب ﷺ نے شاہراہ عام پر نصب کیا تھا؟ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں. امکان اس بات کا ہے کہ عہد نبوی میں یہ راستہ شاہراہ عام نہیں تھا اور خلافت کے دور میں آبادی کے بڑھ جانے اور مکانات کی تبدیلی کی وجہ سے، اسے شاہراہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہو. پرنالے کے مقام کی تبدیلی اور حتیٰ کہ اس کا باقی رہنا یا نہ رہنا، کوئی شرعی مسئلہ نہ تھا، اس کا اکھاڑ نا کوئی گناہ بھی نہ تھا، لیکن جس ہستی نے اس کو نصب کیا تھا، اس کی محبت، ادب اور احترام، متقاضی تھا کہ یہ بھی ایک یادگار رہے اور اس کو باقی رہنا چاہیے.

پھر انصاف کے تقاضے کو دیکھیے کہ فوری طور پر— مراتب کا فرق کیے بغیر— عمل ہوا. امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا مرتبہ کئی وجوہ سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بالا اور بلند تر تھا. قدیم الاسلام تھے، سابقین اوّلین میں سے تھے، مہاجر تھے، عشرہ مبشرہ میں سے تھے، بدری تھے، بیعت رضوان میں شریک ہونے کی سعادت حاصل تھی اور پھر یہ کہ امیر المومنین اور خلیفۂ راشد تھے لیکن ان تمام نسبتوں کے باوجود، جب انصاف اور فیصلے کا وقت آیا تو انہوں نے اپنی ذات کے متعلق بھی وہی فیصلہ کیا جو اس معاملے میں اپنی مملکت کے کسی عام شہری کے متعلق فیصلہ فرماتے.

---

[1] كان للعباس ميزاب على طريق عمربن الخطاب ، فلبس عمر ثيابه يوم الجمعة ، وقد كان ذبح للعباس فرخان، فلما وافى الميزاب صب ماء بدم الفرخين، فأصاب عمر، وفيه دم الفرخين، فأمر عمر بقلعه، ثم رجع عمر، فطرح ثيابه ولبس ثيابا غير ثيابه ثم جاء فصلى بالناس، فأتاه العباس،فقال:واللّٰه إنه للموضع الذى وضعه النبیﷺ فقال عمر للعباس : وأنا أعزم عليك لما صعدت على ظهرى، حتى تضعه فى الموضع الذى وضعه رسول اللّٰه ﷺ (مسند امام احمد بن حنبل رحمة اللّٰه عليه، ومن مسند بنى هاشم ، حديث عباس بن عبدالمطلب رضى اللّٰه عنهم، ج:٣، ص:٣٠٨، رقم الحديث:١٧٩٠)

بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہی اس گھر کو خرید کر مسجد نبوی کی توسیع میں شامل کر دیا تھا اور بطور معاوضہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو گھر بنانے کے لیے زمین کا ایک اور ٹکڑا مرحمت فرما دیا تھا.

آثار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس حد تک بھی محفوظ رکھا جا سکتا تھا اور جتنے بھی عرصے تک محفوظ رکھا جا سکتا تھا، یہ سب کوششیں اسی سلسلے کی ایک کڑی تھیں.

کسی بھی فرد کے سدھار یا بگاڑ میں جب ترقی ہوتی ہے، تو اس کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے. مثل مشہور کہ دو پڑوسنیں ہمیشہ آپس میں لڑتی رہتی تھیں. ایک مرتبہ یہی قضیہ شروع ہوا تو ایک لڑکی نے اپنی ماں کی حمایت میں پہلی مرتبہ اپنی پڑوسن کو گالیاں دیں شام کو اس لڑکی کو گالیوں کے عوض، اس کی پڑوسن نے، آؤ بھگت سے نوازا اور بصد اصرار اُس کی دعوت کی. اہل محلّہ حیران تھے کہ اس لڑکی کی ماں سے اتنا بیر اور اس لڑکی سے آج اتنی گالیاں کھا کر بھی اس کی دعوت. معمہ کسی کو سمجھ میں نہیں آیا. لوگوں نے اس راز کو دریافت کرنے کی کوشش کی تو یہ عورت چپ سادھ گئی وقت گذر گیا اور پھر ایک دن تماشا یہ ہوا کہ اس لڑکی نے خود اپنی ماں کو بھی گالیاں دیں.

اس دوسری عورت نے اہل محلّہ کو جمع کیا اور کہنے لگی کہ میں آج کے دن کے انتظار میں تھی کہ دیکھوں کس دن یہ لڑکی خود اپنی ماں کو بھی اپنی زبان کا مزا چکھائے گی. اس کی دعوت وہ گالیاں کھانے کے باوجود اس خوشی میں تھی کہ اچھا ہوا میری پڑوسن کی بیٹی کی زبان کھلی اور آج اس نے مجھے گالیاں دیں تو اپنی اس زبان کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی دن اپنی ماں کو بھی بے نقط سنائے گی. آج کے دن کی خوشی میں وہ دعوت قبل از وقت (ایڈوانس) میں دی تھی.

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی لازوال تصنیف ''مثنوی'' میں اسی حقیقت کو بیان کیا ہے.

از خدا جوئیم توفیق ادب ۔۔۔ بے ادب محروم ماند از فضل رب

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد ۔۔۔ بلکہ آتش درہمہ آفاق زد

ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ادب کرنے کی توفیق دے اس لیے
کہ بے ادب اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم رہ جاتا ہے. بے ادب انسان صرف
اپنے آپ کو ہی خراب نہیں کرتا بلکہ اس نے ہر طرف فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانی
ہوتی ہے.[1]

ایسے ہی انسانی اخلاقیات میں جب کسی اچھی عادت کا اضافہ ہوتا ہے تو پھر وہ شخص صرف اپنے بڑوں ہی سے نہیں، اپنے برابر کے لوگوں، اپنے چھوٹوں، اپنے پہننے کے کپڑوں اور اللہ تعالیٰ کے رزق، الغرض ہر چیز کا احترام کرتا ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ چیز جاندار ہو یا بے جان.

حضرت رسالت مآب ﷺ نے ادب اور احترام جیسے "خلق عظیم" کی جو آب یاری فرمائی تھی. اس کا اتنا اثر تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود ایک دوسرے کا بھی بے حد ادب کرتے تھے.

حضرت عدی بن حاتم، حضرت جریر البجلی اور حضرت حنظلہ، تینوں صحابی، رضی اللہ عنہم ایک قصبے، قرقیسیاء میں جمع ہوئے. ان میں سے یہ حضرت جریر بن عبداللہ بن جابر اتنے خوبصورت تھے کہ ان کا حسن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ضرب المثل بن گیا تھا. حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اس اُمت کے یوسف یہ ہیں. یہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل مسلمان ہوئے تھے اور پھر جب تک نبوت کا یہ مہر تاباں دنیا میں رہا، حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو اجازت دی کہ وہ جب چاہیں خدمت میں حاضر ہو جایا کریں اور کبھی ایسے نہیں ہوا کہ انہیں دیکھ کر حضرت رسالت مآب ﷺ مسکرا نہ دیئے ہوں.[2]

---

[1] زیر عنوان، درخواستیم توفیق رعایت ادب، دفتر اوّل، ج:۱، ص:۳۹.

[2] أسلم جريرقبل وفاة النبي ﷺ بأربعين يوماً، وكان حسن الصورة ؛ قال عمر بن الخطاب رضي الله عنه : جرير يوسف هذه الأمة ...... عن جرير بن عبدالله، قال: ماحجبني رسول الله ﷺ منذ أسلمت، ولا رآني إلا ضحك. (أسد الغابة، باب الجيم والراء، رقم: ۷۳۰، ج:۱، ص:۵۲۹).

تو اس بستی میں ان کی ملاقات عام لوگوں سے ہوئی معلوم ہوا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو بُرا بھلا کہتے ہیں تو ان تینوں حضرات نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی ایسی بستی میں نہیں رہیں گے، جہاں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی توہین کی جاتی ہو[1] اور پھر وہ قرقیسیاء چھوڑ کر چلے گئے، اس لیے کہ اس بستی میں چند ایسے بے ادب لوگ تھے، جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو دعوت دے رہے تھے. ان تینوں حضرات کے دلوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے جو محبت اور ادب کے جذبات تھے ان کی وجہ سے، ان نفوس ذکیہ نے وہاں کا قیام تک گوارا نہیں کیا.

پھر یہ صرف انہی تینوں حضرات ـــ رضی اللہ عنہم ـــ کی بات نہیں تھی حضرت ابوعثمان النھدی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل بھی یہی تھا. وہ "مُخَضْرَم" تھے. "مُخَضْرَم" کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جسے زمانہ جاہلیت اور زمانۂ اسلام دونوں ملے ہوں. اس نے اسلام قبول کرلیا ہو لیکن کسی وجہ سے حضرت رسالت مآب ﷺ کی زیارت نہ ہوسکی ہو.

حضرت ابوعثمان النھدی رحمۃ اللہ علیہ نے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت کی تھی اور ان سے کئی احادیث، روایت بھی کی ہیں. یرموک، قادسیہ، تستر، نہاوند اور آذربائیجان کی فتح میں شریک رہے. کوفہ کے رہائشی تھے لیکن جب یہ اطلاع ملی کہ کوفہ والوں نے، کوفہ ہی کے قریب، کربلاء کی بستی میں، سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو شہید کر دیا ہے تو انہوں نے کوفہ کو چھوڑ کر بصرہ ہجرت کرلی اور فرمایا:[2]

لا أسكن بلداً قتل فيه ابن بنت رسول الله صلى الله عليه و سلم.	میں ہرگز اس شہر میں نہیں رہوں گا جہاں جناب رسالت مآب ﷺ کے نواسے کو شہید کر دیا جائے.

یہ خوف بھی تھا کہ اتنے بڑے گناہ پر کہیں اس شہر پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ہی نہ ٹوٹ پڑے اس لیے ایسے نالائق اور بے ادب لوگوں کے ساتھ نہ رہنے کا فیصلہ کرلیا کہ یہاں کے باشندے آل رسول علیہ الصلاۃ

---

[1] سير أعلام النبلاء، عدى بن حاتم رضي الله عنه، رقم :٢٦، ج:٣، ص:١٦٢.

[2] سير أعلام النبلاء، ابوعثمان النهدي، رقم ٦٧، ج:٤، ص:١٧٧.

والسلام کا اتنا احترام بھی ملحوظ خاطر نہ رکھ سکے.

حضرت رسالت مآب ﷺ کی اولاد کا سلسلہ طیبہ، حضرت صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا ہی سے چلا ہے. ''حسن''، ''حسین'' یہ دونوں مبارک نام — رضی اللہ عنہما — آپ ہی نے تجویز فرمائے تھے. حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر عرض کیا تھا کہ آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کوئی اور بیٹا دیا تو آپ اجازت دیں. اس کا نام آپ کے نام پر اس کی کنیت بھی آپ کی کنیت، تجویز کر دوں. آپ نے اجازت مرحمت فرمائی.[1]

حضرت خولہ بنت جعفر الحنفیہ سے یہ مبارک و مسعود بیٹا پیدا ہوا. اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کا نام محمد بن علی تجویز فرمایا. ان کی کنیت ابو القاسم قرار پائی لیکن وہ مشہور محمد بن الحنفیہ کے نام سے ہوئے. کبار تابعین میں سے تھے اور عالم اسلام میں حرمین شریفین، شام، عراق جس طرف کا سفر کرتے دیکھنے والوں کی آنکھیں، احترام میں جھک جاتیں.

یہ حضرت محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ، ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں موجود تھے کہ ظالم الامۃ حجاج بن یوسف آیا، یہ نواصب کا سردار اور ناصبیت کا علمبردار تھا. بے ادبی، اُس دور سے لے کر آج تک کے ناصبیوں کی سرشت میں شامل ہے. چنانچہ یہ بے ادب شعائر اللہ کی توہین پر آمادہ ہوا. مقام ابراہیم پر پہنچا اور جس پتھر میں حضرت خلیل اللہ سیدنا ابراہیم علیہ کے قدم مبارک کا نشان ہے، اس پتھر پر چڑھنے کے لیے اپنا پاؤں اُٹھایا. محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ اس بے ادبی کو برداشت نہ کر سکے اور اس ناصبی کو اس حرکت سے نہ صرف یہ کہ منع فرمایا بلکہ ڈانٹ بھی دیا.[2]

---

[1] عن منذر الثوري، عن محمد بن الحنفية، عن على عليه السلام أنه قال لرسول الله صلى الله عليه وسلم: إن ولد لى غلام اسميه باسمك وؤكنيه بكنيتك؟ قال: نعم(أنساب الاشراف للبلاذري، محمد بن الحنفية، ج:٢، ص:٩٢٤.)

[2] عن مغيرة، عن أبيه أن الحجاج أراد أن يضع رجله على المقام، فزجره ابن الحنفية ونهاه(سير أعلام النبلاء، ج:٤، ص:١٢٦.)

یہ اُس دور کی برملا حق گوئی اور تربیت کی برکات تھیں کہ خلاف ادب کاموں پر ڈانٹنے والے کسی کے منصب کی پرواہ کیے بغیر اُسے ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے .اللہ تعالیٰ نے اپنے ''شعائر'' کے ادب اور احترام کا حکم دیا ہے اور شعائر کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اشیاء، افراد یا مقامات جنہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہو جائے جیسے مسجد، قرآن کریم، بیت اللہ اور اولیاء اللہ رحمہم اللہ وغیرہ وغیرہ.

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

ومن یعظم حرمت اللّٰہ فھو خیرلہ عند ربہ .
(پ:۱۷، سورۃ الحج، آیت:۳۰)

اور جو شخص ان چیزوں کا احترام کرے گا، جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے عزت دی ہے تو اس شخص کے حق میں یہ عمل اس کے پروردگار کے نزدیک بہت اچھا ہے.

مقام ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عزت دی ہے، اس کے ادب کو قائم رکھنا ضروری تھا لیکن حجاج بن یوسف ناصبی نے اس ادب کو بھی ختم کرنا چاہا حضرت محمد حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے شعائر اللہ کے اس ادب کی حفاظت کی اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا.

محرم الحرام ۸۱ھ میں ان کا انتقال ہوا. مدینہ طیبہ کے گورنر ابان بن عثمان نے آپ کا جنازہ پڑھایا اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی.

یہ ادب ہی کی بات تھی کہ مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ دائیں جہت تک کا احترام فرماتے تھے چھ سمتوں میں سب سے بہتر اور افضل سمت، اوپر کی مانی جاتی ہے اور پھر دائیں سمت کو ترجیح حاصل ہوتی ہے. کتاب وسنت میں دائیں طرف کی ترجیح، اس کی تفصیل اور تقدس کا ذکر کئی مقامات پر آیا ہے. اس لیے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اس سمت کا اتنا خیال اور اہتمام رہتا تھا کہ فرماتے ہیں.[1]

مابزقت علی یمینی منذ اسلمت.

جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے، کبھی اپنی دائیں جانب نہیں تھوکا.

---

[1] سیر أعلام النبلاء، معاذ بن جبل، رقم:٨٦، ج:١، ص:٤٥٥ .

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور خلافت سے پہلے مدینہ منورہ کے امیر رہے ان کے بچپن سے لے کر اس دور تک کا تمام علم—جو انہوں نے حاصل کیا تھا—صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم ہی سے حاصل شدہ تھا. مدینہ طیبہ خود ان کے دور میں بھی علم کا گہوارہ تھا لیکن حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت ہے کہ وہ کوئی بھی شرعی فیصلہ مشہور صاحب علم تابعی حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھے بغیر نہیں کرتے تھے.

حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کی غیرت نفس اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ اموی خلفاء نے بارہا انہیں طلب کیا کہ ان پر کچھ احسان کریں یا ملاقات ہی ہو جائے لیکن یہ ہمیشہ انکار فرماتے رہے اور یہاں تک کہ ان کے مظالم، کوڑوں، اور ٹھنڈے پانی کی سزا تک کو برداشت کرلیا مگر اپنی یہی آن قائم رکھی. یہی بے غرض صاحب علم وعمل، ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، امیر مدینہ کے پاس تشریف لے گئے. انہوں نے جب دیکھا تو بہت شرمندہ ہوئے اور معذرت خواہانہ انداز میں فرمایا:

> ''ہم نے تو قاصد اس لیے بھیجا تھا کہ آپ کی مجلس میں حاضر ہو کر ایک مسئلے کا حل لے کر آئے، آپ کو زحمت دینا ہرگز مقصود نہ تھا، یہ قاصد کی خطاء ہے کہ آپ کو زحمت اٹھانی پڑی.''

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اپنا علم، ہمارے سامنے نہ لایا ہو، لیکن سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اتنا اور ایسا علم تھا کہ اسے حاصل کرنے کے لیے میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا.

یہ حضرت سعید رحمۃ اللہ علیہ اتنے متقی تھے کہ فرماتے تھے:[1]

جب شیطان، انسان کو گمراہ کرنے میں ہر طرح سے ناکام ہو جاتا ہے تو پھر اس

[1] عن سعيد بن المسيب ، قال : ما أيس الشيطان من شئ إلا أتاه من قبل النساء. ثم قال لنا سعيد وهو ابن أربع وثمانين سنة وقد ذهبت إحدى عينيه وهو يعشو بالأخرى: ما شئ أخوف عندي من النساء.
(سير اعلام النبلاء، سعيد بن المسيب، رقم :٨٨، ج:٤، ص: ٢٣٧).

کے پاس ایک حربہ رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ اس انسان کو عورتوں کے جال میں پھنسا دیتا ہے. (راوی کہتے ہیں) کہ سعید رحمۃ اللہ علیہ کی عمر اُس وقت چوراسی برس ہو چکی تھی اور اُن کی ایک آنکھ جاتی رہی تھی لیکن اِس کے باوجود ہم سے یہ فرمایا کہ مجھے سب سے زیادہ فکر عورتوں کے معاملے میں ہے کہ کہیں اس آزمائش میں نہ پھنس جاؤں.

اس تقویٰ نے انہیں وہ مقام عطا کیا کہ ان کی دعا بالعموم ردّ نہیں ہوتی تھی. اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ کرامت نصیب کی تھی کہ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے جملے رنگ لائے بغیر نہیں رہتے تھے. علی بن زید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے.[1]

کہ ایک دن انہوں نے مجھے فرمایا کہ فلاں شخص کے چہرے اور جسم کی رنگت پر غور کرو. میں نے غور کیا تو اس شخص کا چہرہ سیاہ اور باقی تمام جسم سفید تھا. میں نے یہ کیفیت عرض کی تو رنگت کے اس فرق کی وجہ بیان فرمانے لگے کہ یہ شخص امیر المومنین سیدنا علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کو بُرا بھلا کہتا تھا تو میں نے اسے سمجھایا کہ یہ روش ٹھیک نہیں. اس نے جب یہ بات نہیں مانی اور حسب سابق اس گناہ میں مبتلا رہا تو میں نے اسے بددعا دیتے ہوئے کہا کہ جنہیں تم بُرا کہتے ہو وہ حضرات رضی اللہ عنہم اگر اس سلوک کے مستحق نہیں ہیں اور تم ظلم کر رہے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہارا چہرہ سیاہ کر دے. پھر اس شخص کے چہرے پر

---

[1] قال لي سعيد بن المسيب قال لقائدك يقوم ، فينظر إلى وجه هذا الرجل [وإلى جسده] فقام ، وجاه فقال :رأيت وجه زنجي وجسده أبيض . فقال سعيد: إن هذا سب هؤلاء: طلحة والزبيروعليا رضى الله عنهم ، فنهيته [فأبى]، فدعوت الله عليه، قلت : إن كنت كاذبا فسودالله وجهك، فخرجت بوجهه قرحة، فاسود وجهه.(سير اعلام النبلاء، سعيد بن المسيب، رقم :٨٨، ج:٤، ص: ٢٤٢)

ایک جِلدِی بیماری پھیل گئی اور اس شخص کا چہرہ سیاہ ہوگیا.

کوئی شخص ناحق بات کرے، مخالف ہو، اپنی غلط رائے پر کتنا ہی اصرار کیوں نہ کر رہا ہو، شریعت، اسلام اور انسانی اقدار ہمیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ ہم گالم گلوچ پر اُتر آئیں. یہ تو جاہل اور اَن پڑھ لوگوں کا طرزِ عمل ہے. جس کا مقام جتنا بلند ہے وہ اسی قدر زیادہ قابل ادب ہے. سیدنا علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے درمیان اجتہاد کا اختلاف ہوا تو یہ کچھ انہونی بات نہ تھی مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف ہوتا ہی رہا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا صحیح مسلک یہ ہے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں جتنے بھی حضرات نے امیر المؤمنین خلیفۂ راشد سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اجتہادی اختلاف کیا اُن تمام امور میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اجتہاد بالکل درست تھا اور اُن کے مخالفین سے اجتہادی خطا ہوئی جس پر اُنہیں ایک گنا ثواب ملے گا۔ لیکن آپ غور کر کے دیکھ لیجئے کہ یہ سب اختلاف ادب اور احترام کے دائرے میں رہ کر ہوا ہے. اسلام نے آزادی کی بھی کچھ حدود متعین کی ہیں. مطلقاً آزادی تو جانوروں کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہے' انسانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے. اس لیے ادب کے تقاضے جن حدود و قیود کے طلب گار ہیں' وہ عین انسانیت اور شرافت ہیں.

حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام تو بہت اونچا تھا. ان کا ادب کرنا تو شرعی مسئلہ اور عقیدے کا حصہ ہے، حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کی فطرت میں ادب کا اتنا غلبہ تھا کہ عام گفتگو میں بھی ان الفاظ کا استعمال مناسب نہیں سمجھتے تھے، جن الفاظ سے شعائر اللہ کی تعظیم میں ذرہ بھر بھی کمی محسوس ہوتی ہو چنانچہ وہ فرماتے تھے:[1]

لاتقولوا مصيحف ، ولا مسيجد، ماكان لله فهو عظيم حسن جميل.	یہ مت کہا کرو کہ چھوٹا سا قرآن اور چھوٹی سی مسجد دیکھو جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ بہت بڑی ہے وہ بہت اچھی ہے اور وہ بہت خوبصورت ہے.

[1] سير اعلام النبلاء، سعيد بن المسيب، رقم :۸۸، ج:٤، ص: ۲۳۸.

حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ مشہور اور ثقہ تابعین میں سے تھے.انہوں نے دوسو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت کی تھی وہ دور مسلمانوں کے عروج کا آغاز تھا اس لیے لوگوں کے ظاہری حلیے دیکھنے کی بجائے لوگوں کی صلاحیتوں کو پرکھا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا.کسی بچے میں کیسی ہی معذوری اور کوئی نوجوان کیسا ہی کم صورت کیوں نہ ہو اگر اس میں اپنے آپ کو منوانے کی صلاحیت ہوتی تھی تو پھر وہ اپنے آپ کو منوا بھی لیتا تھا.جسمانی عوارض اور شکل وصورت میں کمی کا، نہ تو کوئی مذاق اڑاتا تھا اور نہ ہی یہ امور کسی بچے کے لیے ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے تھے.لوگ نہ ان کی جسمانی واخلاقی کمزوریوں کا مذاق اڑاتے تھے اور نہ ہی والدین ان کمزوریوں کی وجہ سے بچے کی خوداعتمادی اور حوصلے میں کمی واقع ہونے دیتے تھے.حضرت رسالت مآب ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہی تربیت فرمائی تھی اس لیے وہ کسی معذور بچے یا انسان کا مذاق تو کیا اڑاتے ان کا حال تو یہ تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:[1]

لو سخرت من كلب لخشيت أن أكون كلباً. میں کسی کتے کا مذاق اڑانے سے بھی ڈرتا ہوں کہ اس کی سزا میں کہیں خود ایسا نہ ہو جاؤں.

اسلام نے یہی تعلیم دی ہے کہ کسی بھی چیز کا مذاق نہ اڑایا جائے.کسی کی معذوری پر اس کی دل شکنی نہ کی جائے.بچوں اور بچیوں کے اعضاء ہمیشہ متناسب اور شکل وصورت ہمیشہ اعلیٰ درجے کی نہیں ہوتی لیکن ان کے اندر کی شخصیت جتنی بھی ذہین اور شاندار ہوتی ہے، اُسے اجاگر کرنا چاہیے.ان کی صلاحیتوں کو جلا ہی ملنی چاہیے اور ان کی حوصلہ افزائی کر کے ان کے اعتماد اور حوصلے کو بڑھانا چاہیے.

حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ میں ظاہری اعتبار سے بہت کمی واقع ہوگئی تھی.ان کی رنگت شدید سیاہ تھی ایک پاؤں نہ ہونے کی وجہ سے لنگڑے اور ایک ہاتھ شل ہو جانے کی وجہ سے لنجے تھے.نظر درجہ بدرجہ کمزور ہوتی چلی گئی پہلے ہی بھینگے تھے اور پھر آخر عمر میں نابینا ہو گئے سر کے بال بالکل اڑ گئے

[1] سير اعلام النبلاء، عبدالله بن مسعود ، رقم :٨٧، ج:١، ص: ٤٩٦ .

اور ناک بھی بہت چپٹی تھی لیکن اندر کی شخصیت اتنی شاندار اور علم ودانش میں اتنے نادر روزگار تھے کہ کوئی شخص حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو وہ فرماتے تھے:[1]

یاأهل مكه تجتمعون علي وعندكم عطاء. مکہ مکرمہ کے رہنے والو حیرت ہے کہ مسئلہ پوچھنے کے لیے تم میرے ارد گرد جمع ہو جاتے ہو حالانکہ تمہارے شہر میں عطاء موجود ہیں۔[2]

صغار تابعین کی بڑی تعداد اور خود حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان کے شاگردوں میں سے تھے، حتیٰ کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ تو فرماتے تھے میں جب بھی ان کے پاس کوئی شرعی مسئلہ لے کر گیا، تو ہمیشہ انہوں نے کسی نہ کسی حدیث کی مدد سے میری رہنمائی فرمائی اور ان کا خیال تھا کہ ان کے پاس حضرت رسالت مآب ﷺ کی کئی ہزار احادیث ایسی ہیں جن کی روایات انہوں نے کسی سے بیان نہیں کی۔

ظاہری طور پر ان تمام اعذار کے باوجود ان کی والدہ ماجدہ بہت ہی مطمئن تھیں، فرماتی تھیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے مجھ سے خواب میں فرمایا کہ عطاء مسلمانوں کا سردار اور قائد ہے۔

یہ علم ہی تھا جس کی وجہ سے اس معذور جوان کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ نے اپنا داماد بنالیا تھا۔ جوہر شناس ہی جوہر کا قدر دان ہوتا ہے۔ رِیت یہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد کا احترام کرتے ہیں اور یہاں حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ پر ادب کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ اپنے طلباء کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جوان لڑکے جب علم حدیث حاصل کرنے آپ کی مجلس میں آتے تو وفورِ شوق سے، آپ کے کچھ ارشاد فرمانے سے قبل ہی احادیث پڑھنے لگتے۔ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ اس جذبے کی قدر کرتے تھے

---

[1] كان عطاء أسود أعور أفطس أشل أعرج ، ثم عمي...... كان عطاء أسود شديد السواد، ليس في رأسه شعر إلا شعرات.(سير أعلام النبلاء، عطاء بن أبي رباح ، رقم :٢٩، ج:٥، ص: ٨١) .

[2] سير أعلام النبلاء، عطاء بن أبي رباح، رقم:٢٩، ج:٥ ، ص:٨١.

اور بجائے کسی شاگرد کوٹو کنے کے بعض مرتبہ یہ ارشاد فرماتے:[1]

إن الرجل ليحدثني بالحديث، فأنصت له كأني لم أسمعه ، وقد سمعته قبل أن يولد.

کوئی آدمی میرے پاس آکر مجھے حدیث سنانے لگتا ہے تو میں ایسے خاموش ہوکر اس روایت کو سنتا ہوں کہ گویا میں نے یہ روایت بالکل نہیں سنی حالانکہ یہ حدیث میں نے اس وقت سے سن رکھی ہوتی ہے، جس وقت یہ سنانے والا پیدا بھی نہیں ہوا تھا.

اپنے سے عمر اور علم میں چھوٹوں کا یہ ادب تھا، اور یہ سب اس تربیت کے اثرات تھے، جو حضرت رسالت مآب ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی، کی تھی اور بالواسطہ اس کا اثر یہاں تک پہنچا تھا.

امام عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ بھی کبار تابعین میں سے تھے. جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو اس وقت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی تعداد موجود تھی. پانچ سو سے زائد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تو خود انہوں نے دیکھا اور امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے بارہا نماز بھی ادا کی تھی.علم کا یہ عالم تھا کہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں یہ فتویٰ دیتے تھے صرف نقلیات ہی نہیں ،عقلیات میں بھی کمال رکھتے تھے اور بلا کے ذہین تھے.کسی نے دریافت کیا کہ کیا بدکاری میں پیدا ہونے والا بچہ ان دونوں بدکاروں سے بھی بدتر نہیں ہے؟ وہ شخص یہ چاہتا تھا کہ اگر اس بچے کے بدتر ہونے کا فتویٰ یہ دے دیں تو جب کبھی ایسا بچہ نظر آئے اسے قتل کردیا جائے امام عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوبصورت عقلی جواب دیا کہ دیکھو شریعت نے ایسی عورت پر حد جاری کرنے کا حکم اس وقت دیا ہے، جب وہ بچے کی ولادت سے فارغ ہوجائے.اگر یہ بچہ اتنا ہی بُرا ہوتا جتنا کہ تم سمجھ رہے ہوتو پھر شریعت یہ حکم دیتی کہ اس عورت پر اس حالت میں بھی حد جاری کردی جائے کہ بچہ ابھی اس کے پیٹ میں ہو، تاکہ اس شریر بچے کا بھی خاتمہ ہوجائے.

اس بچے کی زندگی کو بھی شریعت نے تحفظ فراہم کیا ہے.شریعت کے احکامات نہایت گہری حکمت پرمبنی

---

[1] سير أعلام النبلاء، عطاء بن أبي رباح، رقم:٢٩، ج:٥ ، ص:٨٦.

ہیں.فقہاء کے ترتیب دادہ قوانین،حدود اور اجتہاد کسی دیوانے کی بڑ نہیں اور نہ ہی کسی جذباتی سر پھرے لوگوں کے گروہ کا کام ہے.یہ حضرات فی الحقیقت کتاب وسنت کی منشاء سمجھنے اور اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے والے انسان تھے.وہ بدکاری کے فعل سے ضرور نفرت کرتے تھے لیکن بدکار مرد و عورت اور اُس کے نتیجے میں جنم لینے والے بچے سے نفرت نہیں کرتے تھے انہیں بھی اپنے جیسا انسان ہی تصور کرتے تھے اور جذبات کی رو میں بہہ جانے والوں کو توبہ کی تلقین کرتے تھے.گناہوں پر پردہ ڈالنے والے اور لوگوں کی عزتوں سے کھیلنے یا ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والے نہیں تھے.حضرت امام عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جذباتی آدمی کو جو جواب دیا وہ خالصتاً عقلی استدلال تھا اور معتدل مزاجی کے ساتھ شریعت کی حکمت کے عین مطابق تھا.

آج کے زمانے میں آپ بہت سے جذباتی لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ ہر ہر مسئلے میں قرآن وحدیث کا مطالبہ کرتے ہوئے ملیں گے.عقل اور اعتدال کی راہ بتانے والوں کو ہمیشہ یہ کہیں گے کہ جناب یہ مسئلہ قرآن سے ثابت کرو،یہ مسئلہ حدیث میں کہاں آیا ہے،دکھاؤ،حدیث دکھاؤ،حالانکہ معاملہ یوں نہیں ہے.یہ درست ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی قوانین کے اصل ماخذ کتاب وسنت ہیں لیکن ہر ہر مسئلے کا حل کتاب وسنت میں نہیں ملتا.پھر یہ ہوتا ہے کہ مسائل کو حل کرنے کے لیے فقہاء،اجماع،اور قیاس کی طرف رجوع کرتے ہیں.عقل سلیم کی رہنمائی میں پیش آمدہ مسائل پر اجتہاد کر کے فتویٰ دیتے ہیں اور لوگوں کے لیے سہولت اور آسانی کی راہیں —جو بہر حال شریعت ہی کی حدود میں ہوتی ہیں— تلاش کرتے ہیں.مثلاً یہی حضرت امام عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ ہیں،ان سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے نذر مانی کہ وہ کعبۃ اللہ کی زیارت کے لیے پیدل جائے گا.پھر اس شخص نے آدھا سفر پا پیادہ کیا.اور پھر سوار ہو کر بیت اللہ پہنچا تو ایسے شخص کی نذر کا کیا ہوگا؟انہوں نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا کہ یہ شخص آئندہ برس دوبارہ سفر کرے اور جتنا پیدل راستہ طے کر چکا تھا اسے تو سواری پر طے کرے اور جو سواری پر طے کیا تھا اب اس سال اس راستے کو پیدل طے بھی کرے اور

ایک اونٹ بھی صدقہ کرے.

اب اگر کوئی شخص امام عامر الشعبی یا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مطالبہ کرتا کہ جناب یہ مسئلہ تو آپ نے عقل کی بنیاد پر حل کیا ہے قرآن میں کہاں آیا ہے مجھے دکھائیں یا حدیث کا مطالبہ کرتا کہ اُسے دکھائی جائے تو ظاہر ہے کہ کتاب اللہ اور حدیث میں تو اس مسئلے کا کوئی واضح حل نہ تھا اس صورت میں یہ دونوں حضرات یہ مسئلہ، دکھانے سے رہ جاتے۔ پھر آخر اس مسئلے کا حل تھا کیا؟ اُس شخص کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ بغیر کسی دلیل کا مطالبہ کیے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے تجویز کردہ حل پر عمل کرتا۔ اور اگر آپ غور کریں تو یہ محض ایک صحابی رسول علیہم الصلاۃ والسلام کی خالص تقلید تھی.

گہوارہ و منبع علم ہونے کے باوجود حضرت عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ ادب اور احترام کی روایات کو ہمیشہ نبھاتے رہے. نسبتوں کی قدردانی اور انسانوں کی تعظیم کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے رہے.

حضرت جریر البجلی رضی اللہ عنہ کے پوتے جریر بن یزید بن جریر البجلی رحمۃ اللہ علیہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کے لیے تکیہ منگوایا اور پیش کیا کہ وہ ٹیک لگا کر تشریف فرما ہوں. حالانکہ وہ بہت نو عمر تھے لوگوں کو ان کے اس فعل پر تعجب ہوا اور انہوں نے دریافت کیا کہ حضرت آپ کے گردو پیش، بڑی عمر کے لوگ بیٹھے ہیں لیکن آپ نے ان کی بہ نسبت اس لڑکے کا زیادہ احترام کیا ہے کہ آپ نے اُن کی نشست کے لیے تکیہ تک منگوایا، اس کی کیا وجہ ہے؟ ارشاد فرمایا بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ لوگ کہہ رہے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ اس نوجوان کے دادا حضرت جریر البجلی رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کے معزز فرد تھے. وہ ایک مرتبہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو حضرت رسالت مآب ﷺ نے انہیں بھی ٹیک لگانے کے لیے تکیہ پیش فرمایا تھا اور ہمیں یہ فرما کر ادب کی تعلیم دی تھی کہ دیکھیں کسی بھی قوم کا معزز فرد، آپ کے پاس آئے تو ہمیشہ اس کی تعظیم کیجیے.

ہمیں اس واقعہ سے ادب اور احترام کا سبق حاصل کرنا چاہیے۔ کیا ہمارے پاس بھی جب کسی کنبے یا قبیلے یا خاندان کا کوئی فرد آتا ہے، اور خاص طور پر جب کہ وہ ہمارا مخالف بھی ہو تو کیا ہم بھی اس حدیث پر عمل کرتے ہیں؟ کیا ہم بھی اسے کسی عزت اور احترام کا مستحق گردانتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیے اور ہمیشہ اپنے مخالفین کا بھی ادب اور احترام کرنا چاہیے۔ خاص طور پر جب کوئی کافر یا گمراہ انسان آئے تو پھر اس کی تعظیم اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمیں اس تک اسلام کا پیغام یا اپنا صحیح نقطہ نگاہ پیش کرنا ہے۔ اگر ہم اس کی توہین کر کے اسے اپنا مخالف بنالیں لگے یا اسے مشتعل کر دیں گے تو پھر تو گویا کہ ہم نے اُس کے لیے خود صحیح تعلیم کا دروازہ بند کر دیا۔ یہ نہیں ہوا کرتا کہ اللہ تعالیٰ توہین اور نفع کو ایک ہی وقت میں ایک مقام پر جمع فرمادے۔ مناظرے کی روش میں اور صحیح دعوت اور دین کا پیغام پہنچانے کی روش میں بہت فرق ہے۔ آج کل مناظرے میں فریق مخالف کی کمزوریوں اور خامیوں کو تلاش کر کے، حق کو واضح کرنے کی بجائے، اس کی سبکی اور توہین کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے جب کہ داعی الی اللہ اپنے اور اپنے فریق مخالف کے درمیان قدر مشترک تلاش کرتا ہے، تاکہ اس اشتراک قدر سے، اُس کے قریب ہو کر یا اُسے اپنے قریب کر کے، اُس کے احترام کو برقرار رکھتے ہوئے، اس کا ادب کرتے ہوئے، حق کا پیغام اُس کو بالکل واضح اور صاف الفاظ میں حکمت کے ساتھ پہنچادے۔ اسی لیے ہدایت بالعموم مناظروں کی بجائے، دعوت سے پھیلتی ہے کیونکہ اس میں لوگوں کی توہین کی بجائے ان کا ادب کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی انسان کو رسوا کر کے، پھر اس سے یہ توقع رکھنا کہ اب وہ ہماری دعوت یا ہمارے کام کا مثبت جواب دے گا، حکماء اور دانشمندوں کا طریقہ نہیں رہا۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے جو تربیت کی تھی اور جو کچھ ادب سکھایا تھا، وہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واسطے سے تابعین اور پھر تبع تابعین رحمہم اللہ تک بھی پہنچا پھر یہ احترام کی روایات نسل در نسل منتقل ہوتی رہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہ سلجھے ہوئے اور باتربیت بندے اپنے اپنے دور میں آئندہ نسلوں کی تربیت بہت اہتمام سے کرتے رہے، اپنے چھوٹوں کے لیے خود، اسوہ اور قدوہ

(Models) بنتے رہے۔ بڑوں نے سکھایا اور چھوٹوں نے سیکھا، اجداد کا یہ سرمایہ پشت در پشت منتقل ہوتا رہا.

تبع تابعین میں امام وکیع بن الجراح بن ملیح رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت بہت وقیع تھی ۱۲۹ھ میں پیدا ہوئے اور یہ وہ دور تھا جب پورا عالم اسلام تابعین کی کثرت سے اٹا پڑا تھا. ہشام بن عروہ، سلیمٰن الاعمش، ابن جریج، سعید بن السائب، ابن ابی لیلیٰ، مسعر بن کدام، سفیان سعید الثوری، امام اعظم ابوحنیفہ، شریک اور ان کے ہم پلہ افراد رحمہم اللہ کے نور علم سے شہروں کے شہر جگمگا رہے تھے. اللہ مہربان تھا اور مخلوق سجدۂ عبدیت سے سر نہ اُٹھاتی تھی. امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ کے والد کوفہ میں بیت المال کے ملازم اور بہت صاحبِ ثروت (Well off) تھے. گھر میں دولت کی اتنی ریل پیل تھی کہ جب ان کی والدہ ماجدہ کی وراثت تقسیم ہوئی تو ان کا ایک ایک حصہ ایک لاکھ درہم بنا. ان کے جوشاگرد، ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ وکیع رحمۃ اللہ علیہ اتنے عبادت گزار تھے کہ:[1]

> رات سونے سے پہلے قرآن پاک کا ایک تہائی حصہ (دس پارے) ضرور تلاوت کرتے تھے، پھر نیند سے بیداری اور تہجد سے فارغ ہو کر سورۂ ق سے لے کر آخر قرآن تک (سُوَرِ مفصل) کی تلاوت فرماتے اور پھر صبح صادق تک بیٹھے استغفار کرتے رہتے یہاں تک کہ فجر کا وقت شروع ہوجاتا. ان کے بیٹے ابراہیم بن وکیع فرماتے تھے کہ ہمارے والد صاحب اتنی کثرت سے نماز اور نوافل ادا فرماتے تھے کہ ان کی وجہ سے سارے گھرانے میں نماز ادا کرنے کا اتنا ذوق

---

[1] حدثني بعض أصحاب وكيع الذين كانوا يلزمونه، أن وكيعاً كان لاينام حتى يقرأ جزءه من كل ليلةٍ ثلث القرآن، ثم يقوم في آخر الليل، فيقرأ المفصل، ثم يجلس فيأخذ في الاستغفار حتي يطلع الفجر. وقال أبوسعيد الأشج: حدثنا إبراهيم بن وكيع، قال: كان أبي يصلي، فلا يبقى في دارنا أحد إلا صلى حتى جارية لناسوداء. (سيرأعلام النبلاء، وكيع بن الجراح، رقم :٤٨، ج:٩، ص: ١٤٩۔١٤٨).

رچ بس گیا تھا،حتیٰ کہ وہ وقت آیا جب ہمارے گھر میں ہر شخص نوافل ادا کرنے میں لگ گیا یہاں تک کہ ہمارے ہاں ایک سیاہ فام عورت کام کرتی تھی، وہ بھی نوافل پڑھا کرتی تھی.

یعنی فرض نماز کا ذکر ہی کیا وہ تو ہر مسلمان نے پڑھنی ہی ہوتی ہے، دور ایسا تھا کہ ہر شخص روزانہ کچھ نہ کچھ نوافل بھی پابندی سے پڑھا کرتا تھا مثلا کوئی شخص یہ طے کر لیتا تھا کہ روزانہ فرض اور نفل نمازوں (اشراق، چاشت، اوابین اور تہجد وغیرہ) کے علاوہ ایک سو یا دو سو نوافل ادا کیا کرے گا، تو پھر وہ عمر بھر اس معمول کی پابندی کرتا تھا.اس دور کے اکابرین اُمت رحمہم اللہ کے ہاں ایسے واقعات بکثرت مل جاتے ہیں.حضرت وکیع رحمۃ اللہ علیہ کو بھی نماز سے ایسی ہی محبت تھی اور انہیں نماز پڑھنا اتنا اچھا لگتا تھا کہ اگرچہ اپنے شاگردوں کو علم حدیث کی تعلیم دیتے تھے اور اس شرف کے حاصل ہوتے ہوئے بھی فرماتے تھے کہ:[1]

لوعلمت أن الصلاۃ أفضل من الحدیث ماحدثتکم.

اگر شریعت سے یہ بات ثابت ہو جاتی کہ نفل نماز پڑھنا، حدیث پڑھانے سے بہتر ہے تو میں تمہیں حدیث کی تعلیم نہ دیتا.

قوت حافظہ،علم کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے.اُمت میں جن علماء حدیث کا حافظہ ضرب المثل کی حد تک مشہور تھا، امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ ان میں سے ایک تھے.علی بن خشرم رحمۃ اللہ علیہ جو خود بھی ایک محدث تھے، انہوں نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ حافظہ بڑھانے اور قائم رکھنے کے لیے کن دواؤں کا استعمال کرنا چاہیے؟ یعنی ضعف حافظہ کا کیا علاج ہے؟ تو امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر آپ کو بتادوں تو کیا آپ وہ دوا استعمال کریں گے؟ علی رحمۃ اللہ علیہ کو اور کیا چاہیے تھا، بہت مسرت سے عرض کیا ضرور، ارشاد ہو! اللہ کی قسم ضرور استعمال کروں گا تو انہوں نے فرمایا:[2]

[1] ایضاً، ص:۱۵۱.

[2] ایضاً، ص:۱۵۱۔۱۵۲.

ترك المعاصي ماجربت مثله للحفظ. گناہ چھوڑ دینے چاہیں. میرے تجربے کے مطابق حافظہ مضبوط کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی دوا نہیں.

علم، حفظ کا محتاج ہوتا ہے اور انہوں نے حافظہ مضبوط کرنے کا اصل نسخہ ارشاد فرمایا.

امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ سے علم پھوٹتا تھا. یحیٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:[1]

میں نے امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ سے افضل انسان آج تک نہیں دیکھا. سننے والوں کو اس بات پر تعجب ہوا اور عرض کیا گیا کہ کیا عبداللہ بن مبارک (جنہیں آپ نے دیکھا ہے) امام وکیع سے افضل نہیں ہیں. انہوں نے فرمایا، یقیناً ابن مبارک اچھے ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ قبلہ رو ہو کر بیٹھا کرتے تھے، حضرت رسالت مآب ﷺ کی باتیں یاد کیا کرتے تھے، رات بھر عبادت میں مصروف رہتے تھے اور مسلسل روزے رکھا کرتے تھے. حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور امام وکیع نے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ سے (حدیث اور فقہ وغیرہ) بہت کچھ سنا تھا.

اتنے علم کے باوجود بہر حال کبھی خطاء بھی کھا جاتے تھے. بشر تھے اور خطا لوازمات بشریہ میں سے ہے. بعض حضرات نے ان کا جو رجحان اہل تشیع کی طرف اور بعض حضرات نے ان کے کچھ جملے جو حضرت رسالت مآب ﷺ سے متعلق منسوب کیے ہیں وہ ایک علیحدہ بحث ہے لیکن اس کے باوجود ان کا علم قابل اعتبار اور ان کی شخصیت ثقہ اور امین تھی. اہل علم نے ہمیشہ ان پر اعتماد کیا ہے. ان کی شہرت اگرچہ علم

---

[1] علی بن الحسين بن حبان عن أبيه، سمعت ابن معين يقول : ما رأيت أفضل من وكيع ،قيل : ولاابن المبارك ؟ قال : قد كان ابن المبارك له فضل ، ولكن ما رأيت أفضل من وكيع ،كان يستقبل القبلة، ويحفظ حديثه، ويقوم الليل، ويسرد الصوم، ويفتي بقول أبي حنيفة رحمه الله ، وكان قد سمع منه كثيرا.(ايضاً ،ص:١٤٨).

حدیث کی وجہ سے ہے لیکن فقہ کا جو مقام ان کے دل میں تھا اور وہ فقیہہ رواۃ حدیث کو کیسے ترجیح دیتے تھے اس کا اندازہ اس واقع سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شاگردوں کو ایک سند حدیث سنائی جس کے تمام راوی اگرچہ مشائخ حدیث میں سے تھے، لیکن فقہ میں ان کا مقام اونچا نہ تھا اور پھر دوسری سند حدیث سنائی اور اس سند حدیث کے تمام راوی فقہاء عظام رحمہم اللہ تھے، اور پھر دریافت فرمایا کہ آپ لوگوں کے نزدیک کون سی سند زیادہ پسندیدہ ہے؟ شاگردوں نے پہلی سند کو ترجیح دی کیونکہ اس کے راوی مشہور آئمہ حدیث تھے لیکن انہوں نے اپنے شاگردوں کو فقیہہ رواۃ کو ترجیح دینے کی تعلیم دی اور فرمایا: [1]

> کہ دوسری سند زیادہ اچھی ہے کیونکہ میرے استاد، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، فقیہہ تھے پھر ان کے استاد (منصور رحمۃ اللہ علیہ) بھی فقیہہ تھے پھر انہوں نے بھی ایک فقیہہ (حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ) سے روایت کی ہے اور پھر انہوں نے (ابراہیم نخعی) نے بھی ایک فقیہہ صحابی (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) سے حدیث بیان کی ہے. اور پہلی سند میں جو مشائخ، حدیث کے راوی ہیں وہ شیوخ حدیث ہیں. تو وہ حدیث جو ان راویوں کے واسطے سے پہنچی جو راوی فقہاء ہیں، اس حدیث سے بہتر ہوتی ہے جس کے راوی مشائخ حدیث تو ہوں لیکن فقہاء نہ ہوں.

احادیث کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ اس زریں اصول کو سامنے رکھنا چاہیے کہ حدیث کے راوی فقیہ ہیں یا کہ نہیں. امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ایک بہت مضبوط اصول اپنے شاگردوں کو سمجھایا۔

---

[1] خرج علینا وکیع یوماً، فقال: أيّ الاسنادین أحب إلیکم: الأعمش، عن أبي وائل، عن عبداللّٰه. أو سفیان، عن منصور، عن إبراهیم، عن عبداللّٰه؟ فقلنا: الأعمش، فإنه أعلی. فقال: بل الثاني، فإنه فقیه، عن فقیهٍ، عن فقیه، والآخر عن شیخٍ. وحدیث یتداوله الفقهاء خیر من حدیث یتداوله الشیوخ. (ایضاً، ص:۱۵۸).

دراصل کچھ راوی ایسے ہوتے ہیں جن کی تمام تر توجہ ان الفاظ کی حفاظت پر مرکوز ہوتی ہے جو الفاظ حدیث میں آئے ہیں. ان کا حافظہ بھی بَلا کا ہوتا ہے اور ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس ایک ایک حرف کو بھی یاد رکھنے کی کوشش کریں، جو حروف اُن تک پہنچے ہیں جب کہ دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو اگرچہ الفاظ حدیث کو بھی یاد اور ضبط کرنے کو اہم اور ضروری جانتا ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ ان معانی کو سمجھنے اور ان مسائل کو بھی اس حدیث سے مستنبط کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، جو اس حدیث کی اصل روح ہیں اور حضرت شارع علیہ الصلاۃ والسلام جسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں. تو ایسے حضرات جب کسی روایت کو بیان کرتے ہیں، وہ یقیناً ان حضرات سے زیادہ بہتر طریقے پر حدیث کو سمجھ رہے ہوتے ہیں، جنہوں نے محض ان الفاظ حدیث کو یاد کیا ہوتا ہے. اُمت میں یہ فرق حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا. اسی لیے وہ فقہاء جو محدثین بھی ہیں ان حضرات سے بدرجہا بہتر ہیں، جو محدث تو یقیناً ہیں لیکن فقیہ نہیں ہیں. ولکل وجهة هو موليها.

امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی زندگی ہی میں مغفرت کی بشارتیں ملنے لگی تھیں. قبر اور جنت میں اُن کا مقام اُن کا منتظر تھا. ان کے بیٹے ملیح بن وکیع فرماتے تھے کہ:[1]

> ''میرے والد گرامی نے مرض الموت میں اپنے دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے مجھے دکھائے اور فرمایا کہ میرے بیٹے آپ میرے ہاتھوں کو دیکھ رہے ہیں. میں نے عمر بھر ان دونوں ہاتھوں سے کسی کو نہیں مارا.''

ان کی اس پارسائی کا علم داؤد بن یحییٰ کو ہوا اور انہیں خواب میں جب حضرت رسالت مآب ﷺ کی

---

[1] وعن مليح بن وكيع، قال : لما نزل بأبي الموت ، أخرج يديه، فقل : يابني ترىٰ يدي، ماضربت بهما شيئاً قط . قال مليح : فحدثت بهذا داود بن يحيى بن يمان ، فقال : رأيت رسول الله ﷺ في النوم، فقلت : يا رسول الله من الأبدال ؟ قال : الذين لا يضربون بأيديهم شيئاً، وإن وكيعاً منهم.(ایضاً ، ص:۱۵۹).

زیارت ہوئی تو عرض کیا کہ: ''ابدال'' کون ہوتے ہیں؟ ارشاد ہوا'' وہ جو کسی کو اپنے ہاتھوں سے تکلیف نہ دیں'' یقیناً وکیع رحمۃ اللہ علیہ انہی ابدال میں سے ایک تھے.

یہ تمام حضرات (امام وکیع، ان کے بیٹے ملیح بن وکیع اور داؤد بن یحییٰ رحمہم اللہ) دوسری صدی ہجری کے افراد ہیں. مندرجہ بالا حکایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی میں ''ابدال'' کی اصطلاح شہرت پا چکی تھی اور لوگ اس سے واقف تھے. تصوف کے مخالف حضرات ''ابدال'' کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور پھر اس بات کو بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ یہ تمام اصطلاحات ''ابدال'' وغیرہ، ان کی شریعت میں کوئی اصل نہیں اور یہ کہ یہ باتیں بدعت ہیں اور خیر القرون سے کئی صدیوں کے بعد یہ الفاظ وجود پذیر ہوئے ہیں تو اِنہیں اس حکایت پر غور کرنا چاہیے کہ ''ابدال'' کا وجود اور اصطلاح بدعت ہے یا یہ حضرات تابعین اور پھر تبع تابعین رحمہم اللہ کے ہاں بھی یہ تصور شریعت کے مطابق پایا جاتا تھا حتی کہ مجتہد مطلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی ابدال کے وجود کو تسلیم فرماتے تھے. ان امور کو بدعت قرار دینے کے لیے بہت گہرا اور وسیع علم درکار ہے محض سطحی یا سرسری مطالعے کے سرمایے کے ساتھ اس میدان میں اترنا خود اپنے ہی ہاتھوں شکست کا سامان پیدا کرنا ہے.

امام ابوزکریا یحییٰ بن سلیم الطائفی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی پڑھنے چاہیں. حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: [1]

كان رجلا فضلا كنا نعده من الابدال .	وہ بہت صاحب علم انسان تھے اور ہم انہیں ابدال میں شمار کیا کرتے تھے.

امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے اس مرض الموت میں اپنے استاد حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت ہوئی اور انھوں نے بشارت دی کہ انہیں وفات کے بعد ان کے پڑوس میں جگہ دی جائے گی اور آخر کار دس محرم الحرام ۱۹۷ھ میں سفر حج سے واپسی پر اُن کا انتقال ہو گیا۔ عمر بھر اتنے باادب رہے کہ وہ

---

[1] سير أعلام النبلاء، الطائفي، رقم: ۹۲، ج: ۹، ص: ۳۰۷.

شخص جس نے سات برس آپ کے ساتھ بسر کیے — سلم بن جنادہ رحمۃ اللہ علیہ — ان کا بیان ہے کہ:[1]

فمارأيته بزق ولامس حصاةً، ولا جلس مجلسا فتحرك، ومارأيته إلا مستقبل القبلة وما رأيته يحلف بالله .	میں نے انہیں کبھی بدتہذیبی سے تھوکتے نہیں دیکھا. مسجد میں صفوں کو سیدھا رکھنے کے لیے جو کنکریاں رکھی جاتی تھیں، کبھی نہیں دیکھا کہ وہ مسجد میں بیٹھے

ہوں اوران کنکریوں کو بلاوجہ ادھر ادھر کر رہے ہوں. نہ ہی یہ دیکھا کہ وہ ایک مرتبہ بیٹھ گئے ہوں، تو پھر بلاوجہ اپنے جسم کو ہلاتے رہیں، ہمیشہ قبلہ رخ ہو کر بیٹھتے تھے اور میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کبھی بھی اللہ تعالیٰ کا نام لے کر قسم اُٹھائی ہو.

ادب اور احترام کی اس کیفیت کو سمجھنا چنداں دشوار نہیں، جو لوگ دنیوی اعتبار سے کسی بڑے عہدے پر متمکن رہے ہوتے ہیں یا جنہیں بڑے بڑے عہدے داروں کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملا ہوتا ہے، وہ اس مادی دنیا کے سربراہوں کے سامنے بالکل بُت بنے بیٹھے رہتے ہیں. بلاضرورت ایک لفظ زبان سے نہیں بولتے اور بلا حاجت اپنی انگلی تک کو حرکت نہیں دیتے. اسی طرح جن افراد کی تربیت ہو چکی ہوتی ہے وہ جب اہل اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو ہمیشہ ادب سے بیٹھتے ہیں اور بلاضرورت اپنی نگاہ تک اٹھانے سے گریز کرتے ہیں. وہ مجالس کا ادب اور شخصیات کا احترام خوب جانتے اور سمجھتے ہیں. بس جن حضرات پر استحضار و معیت الٰہیہ کا غلبہ ہو جاتا ہے اور ان کی روح ہر لمحہ کیفیت حضوری سے سرشار رہتی ہے وہ بھی بلاتشبیہ خود کو بارگاہ الٰہی کے حاضرین میں گمان کرتے ہیں اور اس ذات پاک کا استحضار انہیں ہر بے فائدہ حرکت اور کام سے پرے رکھتا ہے.

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا وقار اور اُن کا استحضار، انہیں اس بات سے باز رکھتا ہے کہ وہ کبھی تنہائی میں بھی بے ادبی کا ارتکاب کریں.

امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ خیر القرون کے چنیدہ اکابر میں سے تھے. اس دور کی اپنی

---

[1] سير أعلام النبلاء، وكيع بن الجراح، رقم: ٤٨، ج:٩، ص: ١٥٥ .

برکات بھی بہت تھیں کیونکہ وہ دور حضرت رسالت مآب ﷺ کے عہد میمنت لزوم سے متصل تھا اس لیے مسلمان معاشرے پر ادب واحترام کا غلبہ تھا.

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تعریف وتعارف سے بلندتر، ہر دور میں اُمت کے مشہور محدث اور فقیہ کے طور پر پہچانے جاتے رہے ہیں. ان کی عمر نوے برس سے بھی تجاوز کر گئی تھی اور ہر ایک خلیفۃ المسلمین جب مدینہ طیبہ حاضر ہوتا تو آپ کی خدمت میں حاضری کو شرف گردانتا اور اگر آپ اُسے ملاقات کی اجازت دے دیتے تو وہ اِسے غنیمت تصور کرتا. (غالبًا) خلیفہ ہارون الرشید، جس نے سلطنت عباسیہ کو استحکام بخشا اور مزید اُس کی میخیں گاڑیں، آپ کی خدمت میں حاضر ہوا. یہ وہ دور تھا جب مسجد نبوی میں، حضرت رسالت مآب ﷺ کا منبر اپنی اصلی حالت میں موجود تھا. خلیفہ ہارون الرشید نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ لیا کہ اگر وہ اجازت دیں تو اس منبر کی بجائے اسی مقام پر سونے اور چاندی کا ایک اور منبر بنوا کر اِس میں جواہرات جڑ دیے جائیں. ہارون الرشید نے چاہا کہ اس کے دل میں حضرت رسالت مآب ﷺ کے لیے جو محبت اور جاں نثاری ہے، اس کا کچھ حق خدمت، ادا ہو لیکن حضرۃ الامام رحمۃ اللہ نے منع فرما دیا اور ارشاد ہوا:[1]

فلا أرى أن يحرم الناس أثر رسول الله صلى الله عليه وسلم. — میرا خیال ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے آثار سے امت کو محروم نہ کیا جائے.

یہ ادب اور احترام تھا، اس منبر کا بھی جسے حضرت رسالت مآب ﷺ کے ہاتھوں اور پاؤں نے چھوا تھا اور لکڑی کے ان تختوں کا بھی، جن پر آپ تشریف فرما ہوئے تھے. ہارون الرشید نے ہیرے اور جواہرات اس مقام پر جڑانے چاہے لیکن حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے غایت ادب سے اس منبر کو تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دی.

إمام الهدى مازال للعلم صائناً — عليه سلام الله فى آخر الدهر

---

[1] سیر أعلام النبلاء، مالك الامام، رقم: ١٠، ج:٨، ص: ٤٨.

(حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہدایت کے امام تھے اور ہمیشہ علم کی حفاظت فرماتے رہے. اللہ تعالیٰ کی سلامتی ان پر نازل ہوتی رہے جب تک کہ دنیا باقی ہے).

یہ واقعات تو قرون اولیٰ کے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب ایسے لوگ نہیں پائے جاتے جو ادب اور احترام کی روایات کے امین نہ ہوں، اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور آئندہ بھی ایسے لوگ ہی فلاح پائیں گے جو ان روایات کو برقرار رکھیں گے. ایسی باادب ہستیاں اب اگرچہ کم یاب ہیں لیکن نایاب نہیں ہیں.

اپنے شیخ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی رحمۃ اللہ علیہ نے امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی وقیع سوانح تحریر فرمائی. اس کتاب کو کیوں لکھا گیا اور اس شاندار تصنیف کا اصل محرک کون تھا؟ اس سوال کو جواب حضرت ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے خود تحریر فرمایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے کسی درمیانی سال کا ذکر ہے کہ برادر معظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے (جو اس وقت سے میرے مُربّی وسرپرست تھے جب کہ میری عمر نو سال تھی، اور میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تھا) ایک روز بڑے درد کے ساتھ گلوگیر آواز میں کہا: ''علی! تم کو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی سیرت پر کتاب لکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ صلاحیت بخشی ہے کہ یہ کام کرسکو.'' (المرتضیٰ، ص:۲۱)

اپنے برادر اکبر و معظم مولوی حکیم ڈاکٹر سعید عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس حکم کا احترام اتنا غالب تھا کہ تینتیس برس گذرنے کے باوجود اپنے اس فریضے سے غفلت نہیں برتی اور ادب اور احترام ہر مصروفیت اور مشغولیت پر غالب آیا اور یہ اپنے برادر اکبر و معظم کا ادب اور احترام ہی تھا جو اس شاہکار تصنیف کو وجود میں لانے کا باعث بنا. مزید آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

> ''راقم نے اس سخت آزمائش کے علمی سفر میں اس وقت قدم رکھا جب عمر کے

انحطاط کا زمانہ ہے، صحت کمزور، مشاغل روز افزوں، اسفار کی کثرت مستزاد، بہر حال اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اپنی سعادت سمجھ کر اور اس کے اجر کی امید میں اس مہم کو سر کرنے کا ارادہ کیا، اور جب ارادہ کر لیا، تو دل و دماغ پر یہی فکر سوار ہوگئی، بلکہ اعصاب پر اس طرح مسلط ہوگئی کہ کچھ اور لکھنے یا کسی اور موضوع پر سوچنے کا یارا نہ رہا۔'' (المرتضیٰ، ص:۲۴)

یہ ادب اور احترام ہی کی روش تھی جس نے انہیں ہر دلعزیز ہونے اور عنداللہ مقبولیت کی سند عطا کی تھی. رائے بریلی، جو اَب بھی ایک قصبہ ہے اس سے لے کر بین الاقوامی سطح تک اُن کی مقبولیت کا راز، اُن کی یہ روشِ ادب ہی تھی، جو اپنے اکابر تو درکنار، اپنے اصاغر تک کے معاملہ میں آخرِ عمر تک، نمایاں رہی. نور اللّٰہ مضجعه و طاب ثراہ.

علم اپنی ہستی کا شعور بیدار کرتا ہے اور بار بار یہ احساس دلاتا ہے کہ تمہارا وجود ہے جب کہ ادب کی تلقین یہ ہے کہ اپنے آپ کو مٹاؤ. اپنے بڑوں سے اختلاف کرو تو ادب کی حدود میں رہ کر. ان کے رائے کے برعکس رائے ہو تو اس کے اظہار کے لیے موزوں الفاظ اور مناسب لہجہ، دونوں میں شائستگی چاہیے اس لیے جن لوگوں پر علم کا غلبہ ہوتا ہے اگر وہ ادب سیکھے ہوئے نہ ہوں تو یہ علم اُن کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجابِ اکبر بن جاتا ہے. اس علم ہی کے غرے میں وہ دوسروں کی توہین کرتا ہے اور اس علم ہی کی بنیاد پر قوانین الٰہی سے بغاوت ہوتی ہے. علم کے مفاسد کی دوا، اَدب ہے، وگرنہ یہ تو ایسا منہ زور گھوڑا ہے کہ معاذاللّٰہ، اللہ تعالیٰ کے احکامات کو پامال کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے.

شیخ الاسلام محمد بن ابراہیم بوشنجی نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ[1] فرماتے تھے:

من أراد العلم والفقه بغير أدب، فقد اقتحم أن — جو شخص بھی علم اور فقہ کو بغیر ادب کے حاصل کرنا چاہتا

---

[1] سیر أعلام النبلاء، البوشنجي، رقم: ۳۰۳، ج:۱۳، ص: ۵۸٦.

یکذب علی اللّٰہ و رسولہ. ہے وہ ضرور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو جھٹلا دے گا.

کیوں جھٹلا دے گا؟ اس لیے کہ علم سے جو غرور پیدا ہو گا اس کا تقاضہ یہ ہو گا کہ جو بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی، وہ ردّ کیے جانے کے قابل ہے. تو وہ تمام روایات جو ماورائے عقل ہیں، اس متکبر عالم کے ہاں پہنچ کر، جھوٹ قرار دے دی جائیں گی. اور ادب جس نے اس علم کے غرور کا علاج کرنا تھا، جب وہ نہیں ہو گا تو یہ کتاب وسنت کی باطل تاویلات اور تکذیب کا شکار ہو جائے گا. علم اور ادب کی باہمی نسبت کی گرہ کشائی حضرت یوسف بن حسین الرازی المتوفی ۳۰۴ھ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کی ہے. وہ اپنے دور میں شیخ الصوفیہ تھے فرماتے تھے:[1]

> ''اساتذہ کا ادب کرنے سے صحیح علم ملتا ہے اور پھر صحیح علم تمہارے عمل کو بھی صحیح کر دے گا. پھر اس صحیح عمل سے حکمت حاصل ہو گی اور حکمت سے زھد ملتا ہے جو کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی زندگی کو بہتر کرنے کا جذبہ اُبھارتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشی ایسے ہی حاصل ہوتی ہے.''

رضائے الٰہی جو مومن کی زندگی کا منتہا ہے، اس کا بیج ادب ہی سے پھوٹتا ہے اور اس ادب کے درخت کی آبیاری جب صحیح علم اور صحیح عمل سے ہوتی ہے تو پھر اس پر رضائے الٰہی کا پھل لگتا ہے. دین سے تعلق رکھنے والے حضرات کا تو کہنا ہی کیا، جن لوگوں نے دنیا پر بادشاہت کی اور اپنی حکمرانی کے جھنڈے گاڑے تھے انہیں بھی اپنی اولادوں کی تربیت میں اس بات کا شعور تھا کہ انہیں سب سے پہلے ادب اور احترام سکھایا جائے. مامون الرشید خلفاء بنو عباس میں سب سے زیادہ کرّ وفر کا خلیفہ تھا. اُسے اہل علم کا ادب واحترام اپنے والد ہارون الرشید سے ورثے اور گھٹی میں ملا تھا۔ ہارون الرشید اس جاہ وجلال کا

---

[1] وعنه قال: بالأدب تتفهم العلم، وبالعلم يصح لك العمل، وبالعمل تنال الحكمة، وبالحكمة تتفهم الزهد، وبالزهد تترك الدنيا، وترغب في الآخرة، وبذلك تنال رِضى اللّٰه تعالىٰ. (سير أعلام النبلاء، يوسف بن الحسين، رقم: ۱۵۳، ج: ۱٤، ص: ۲۵۰).

حکمران ہونے کے باوجود، اپنے دورِ خلافت میں ایک سو نوافل ادا کرتا تھا اور اس کا یہ معمول اُس کی وفات تک جاری رہا. اس نفلی عبادت کے ساتھ ساتھ روزانہ ایک ہزار دینار صدقہ بھی کرتا تھا اور یہ نیکی بھی، وہ اپنی وفات تک کرتے رہے.

۱۷۹ھ ہجری کے رمضان المبارک میں ہارون الرشید عمرے کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے اور جو احرام باندھا تھا، پھر اسی میں عمرے کے بعد حج کی نیت کر لی اور تقریباً ــــ حج تک کے یہ ــــ تین مہینے مسلسل حالت احرام ہی میں گزارے. اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنے کے جذبے اور اس لم یزل کی بارگاہ میں شکر ادا کرنے کے لیے. اپنی بندگی اور اس بے نیاز ذات کی رضا حاصل کرنے کے لیے یہاں تک کہ مکہ مکرمہ میں پیدل حج کیا.

اہلِ علم کا اتنا ادب اور احترام تھا کہ امام ابو حاتم اصمعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے ایک مرتبہ ہارون الرشید نے مجھے پانچ ہزار درہم بطور ہدیہ پیش کیے اور فرمایا کہ امراء کی مجلس میں ہمارے وقار کو قائم رکھیے گا لیکن جب تنہائی ہو جائے تو پھر ہمیں علم سکھائیں.

امام ابو معاویہ الضریر رحمۃ اللہ علیہ ــ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے ــ نابینا تھے لیکن ہارون الرشید ان کا اتنا ادب کرتا تھا کہ وہ فرماتے تھے ایک مرتبہ کھانے کے بعد کسی شخص نے میرے ہاتھ دھلانے شروع کر دیئے. پھر وہ بولا حضرت! آپ کو معلوم ہے کہ کون آپ کے ہاتھ دھلا رہا ہے. میں نے جواب دیا کہ نہیں معلوم. اُس شخص نے کہا میں ہارون الرشید آپ کے ہاتھ دھلا رہا ہوں، آپ کے علم کے احترام میں.

حضرت امام شمس الدین الذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب سیر اعلام النبلاء کی نویں جلد میں ہارون الرشید کے تذکرے میں ان تمام واقعات کا ذکر کیا ہے.

سو مامون الرشید کو علم کا شوق اور اہلِ علم کا ادب و احترام اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا. وہ چاہتا تھا کہ یہ علم و ادب اُس کے دونوں بیٹوں میں بھی منتقل ہو. چنانچہ اس مقصد کے لیے اُس نے اپنے دونوں

بیٹوں کو —عربی گرائمر کی تعلیم کے لیے — علامہ ابوزکریا یحیٰ بن زیاد الفراء رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے کیا.انھوں نے ان شہزادوں کی تعلیم وتربیت شروع کی یہ امام فرّاء رحمۃ اللہ علیہ ایک دن اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے مسند درس سے اُٹھے تو دونوں شہزادے اُن کے جوتے سیدھے کرنے کے لیے دوڑ پڑے. ہر بھائی یہ چاہتا تھا کہ پہلے وہ جوتے سیدھے کرے اور انہیں استاد کو پہنانے کی سعادت حاصل کرے.آخر ایک شہزادے نے ایک جوتا اُٹھایا اور دوسرے شہزادے نے دوسرا جوتا اور دونوں نے امام فراء رحمۃ اللہ علیہ کو ایک ایک جوتا پہنایا. یہ بات خلیفۂ وقت مامون الرشید تک پہنچی تو انہوں نے کہا[1]:

لن یکبر الرجل عن تواضعه لسلطانه وأبیه ومعلمه.	جب تک انسان، حکمرانوں، اپنے والد اور اپنے استاد کے سامنے جھکا رہتا ہے، اس میں غرور پیدا نہیں ہوتا.

کیا سنہرا دور تھا جب ادب اور احترام کی حکمرانی، حکمرانوں سے لے کر مملکت کے ایک عام فرد تک، سب پر تھی.مسلمانوں کو اِس ادب ہی نے ، دنیا میں ترقی دی اور ان کے دین کو قائم رکھا.شہزادے بھی اپنے اساتذہ کے جوتے سیدھے کرنے کے لیے دوڑ پڑتے تھے .پھر جب سے اُمت کے چھوٹوں نے بڑوں کے جوتے سیدھے کرنا چھوڑ دیے، اُمت کو جوتے پڑنے لگے.

[1] وكان المأمون قد وكل بالفراء ولديه يلقنهما النحو ، فأرد القيام ، فابتدرا إلى نعله ،فقدم كل واحد فردة، فبلغ ذلك المأمون، فقال : لن يكبر الرجل عن تواضعه لسلطانه وأبيه ومعلمه. (سيرأعلام النبلاء ، الفراء، رقم :١٢ ، ج:١٠ ، ص: ١١٨).

المُناد کے اغراض ومقاصد

المُناد کی دعوت کا اصل ہدف فرد ہے اور فرد کی اصلاح کیلئے ہر ماہ آپ کی خدمت میں پیش ہے :۔

(۱) قرآن کریم کا آسان ترجمہ اور عام فہم تفسیر۔

(۲) ریڈیو FM 100 سے نشر کیے جانے والے دو مشہور زمانہ پروگرام :۔

☆ الفرقان ☆ عبقات بصورت تحریر :۔

(۳) روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا، شریعت کے مطابق حل۔

AL MUNAD

MONTHLY

29/ Press, Dec ڈیکلریشن نمبر

Rabi-Ul-Sani 1431/ April2010

Volume-1

Issue-3

Printed and published at Instant Print System (Pvt) Ltd.
G-10/4, Islamabad by Muhammad Rashid
on behalf of
AL-NADWA EDUCATIONAL TRUST
CHATTER PARK ISLAMABAD
PAKISTAN 46001